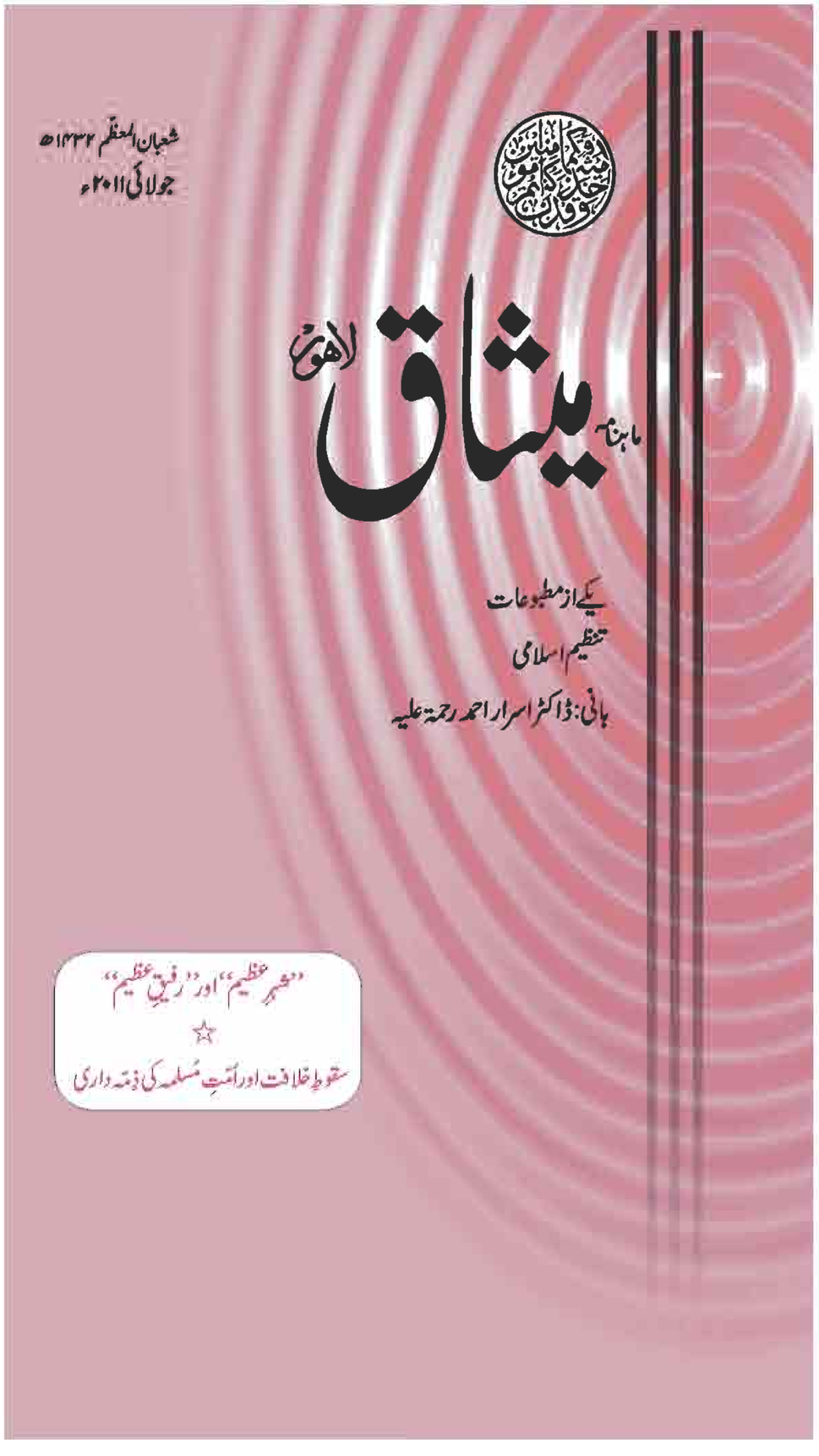

مشمولات

عرضِ احوال ________ 3

افواجِ پاکستان کی بے توقیری کیوں؟ — ایوب بیگ مرزا

بیانُ القُرآن ________ 5

سورۃ الاعراف (آیات ۱ تا ۳۱) — ڈاکٹر اسرار احمد

آمدِ بہار ________ 25

☆ ”شہرِ عظیم“ اور ”رفیقِ تنظیم“ — اویس پاشا قرنی

متاعِ کارواں ________ 43

سقوطِ خلافت اور اُمت مسلمہ کی ذمہ داری — ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر

حسنِ معاشرت ________ 56

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

فضائل و آداب — حافظ محمد زاہد

کتابِ زندہ ________ 67

کتاب اللہ۔ معجز نما کلام — عتیق الرحمٰن صدیقی

فرائضِ دینی ________ 77

داعی اور دعوتِ دین کا دائرہ کار — حافظ محمد مشتاق ربانی

تذکیر و موعظت ________ 81

نفل نمازوں کی اہمیت اور ضرورت — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

نقد و نظر ________ 85

غلام احمد پرویز — حافظ محمد زبیر

❁ ❁ ❁

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرّحیم

افواجِ پاکستان کی بے توقیری کیوں؟

افواجِ پاکستان کے لیے بدترین وقت ۱۹۷۱ء کا وہ سانحہ تھا جب ایک فوجی حکمران کے عہد میں پاکستان شکست و ریخت سے دوچار ہوا۔ فوجی سطح پر یہ ایک معمولی شکست نہیں تھی بلکہ کسی فوج کو جو بدترین انداز میں شکست ہوسکتی تھی وہ ہوئی یعنی وہ دشمن کے سامنے ہتھیار ڈال دے۔ پاکستان کی فوج نے اپنے بدترین' ازلی اور پیدائشی دشمن کے سامنے ہتھیار پھینکے۔ پاکستان کو ۱۹۷۱ء کے بعد بھی بعض صدمات برداشت کرنے پڑے۔ ایسے مواقع پر لیڈران نے جوشِ خطابت میں اور لکھاریوں نے اپنی تحریر کو مزین کرنے کے لیے یقیناً یہ لکھا کہ یہ صدمہ یا یہ سانحہ کسی طرح ۱۹۷۱ء کے سانحے سے کم نہ تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۷۱ء سے بدتر سانحہ کا وقوع پذیر ہونا ممکن ہی نہیں۔ ایک ملک دو ٹکڑوں میں بٹ گیا۔ ہمیں اُس ہندو کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے جسے ہم دن رات بزدلی کے طعنے دیتے تھے۔ طنزیہ قہقہوں میں یہ نغمہ بکھیرا جاتا تھا کہ 'جنگ کھیڈ نہیں ہوندی زنانیاں دی' (یعنی جنگ کرنا عورتوں کے بس کی بات نہیں) پھر فلک نے یہ نظارہ بھی دیکھا کہ ٹائیگر نیازی اپنی بیلٹ کھول کر اور اپنا خالی پستول جنرل اروڑا کو پیش کر رہا تھا۔ یہ ایک عظیم حادثہ تھا۔ قوم دھاڑیں مار مار کر روئی۔ مال روڈ پر لوگوں نے اپنے سر دیواروں کو مارے۔ اُس وقت فوج پر تنقید ہوئی' عوامی سطح پر برا بھلا کہا گیا' بعض مواقع پر آوازے کسے گئے' لیکن پاکستان کی تاریخ کے اس عظیم ترین حادثہ پر بھی فوج پر تنقید شدت اور طوالت کے حوالہ سے اتنی نہ تھی جتنی تنقید آج ہو رہی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ میڈیا خصوصاً الیکٹرانک میڈیا پر پاکستان کے کسی بھی ادارے پر آج تک اتنی شدید اور برہنہ تنقید نہیں ہوئی جتنی فوج پر ہو رہی ہے تو یہ مبالغہ نہ ہوگا۔ ۲ مئی اور ۲۲ مئی کے واقعات یقیناً انتہائی سنگین تھے اور وہ افواجِ پاکستان کے کسی نہ کسی شعبہ یا شعبہ جات کی غفلت' نااہلی اور مکمل ناکامی کے منہ بولتا ثبوت تھے۔ اس کے باوجود ہمارے لیے انتہائی حیران کن بات ہے کہ جس ادارے کے تقدس کو ۱۹۷۱ء جیسا سانحہ کوئی بہت بڑی زک نہ پہنچا سکا اور جو ماہ مئی سے پہلے تک ایک بار پھر مقدس گائے کی حیثیت اختیار کر چکا تھا' اس سے پہلے اوّل تو کسی میں ہمت نہ تھی کہ کوئی اُس پر میڈیا میں تنقید کرے' اگر کبھی کبھار کوئی ہلکی پھلکی بات ہو بھی جاتی تھی تو فوج اور آئی ایس آئی کا نام لینے کی بجائے اسٹیبلشمنٹ اور حساس اداروں جیسے الفاظ کی آڑ لے کر کی جاتی تھی۔ ہم کسی پر کوئی الزام نہیں لگاتے' لیکن اس حقیقت کو کس طرح نظرانداز کر دیں کہ جونہی امریکہ اور افواجِ پاکستان کے تعلقات میں بگاڑ پیدا ہوا افواجِ پاکستان پر الیکٹرانک

میڈیا کے قریباً تمام نیوز چینل ٹوٹ پڑے۔ جیسے کوئی بند ٹوٹ گیا ہو یا لاوا پھٹ پڑا ہو۔

اب ہم افواجِ پاکستان سے براہِ راست مخاطب ہوتے ہیں' کوئی مانے نہ مانے یا ہم پر کسی قسم کا فتویٰ صادر کر دیا جائے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری افواج' پاکستان کی جغرافیائی حفاظت اور سلامتی کے بارے میں مخلص بھی ہیں اور dedicated بھی۔ یہاں تک کہہ دینے میں کوئی حرج نہیں ہوگا کہ ان کے سر پر تحفظ پاکستان کا جنون سوار ہے۔ اگرچہ یہ بھی اپنی جگہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ نائن الیون کے بعد امریکہ اور نیٹو کی صلیبی جنگ میں طالبان کے خلاف ان کا ساتھ دینے کا فیصلہ ہمارے نزدیک ہرگز پاکستان کے مفاد میں نہیں تھا۔ یہ جنرل مشرف کی نادانی اور حماقت ہی نہیں' اسلام دشمنی تھی کہ اس نے ایسا غیر دانشمندانہ فیصلہ کیا جو صریحاً پاکستان کی بربادی کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ تاہم اس شخص نے یہ سب کچھ بھی ''سب سے پہلے پاکستان'' کے نعرے کے تحت کیا تھا اور افواجِ پاکستان نے تحفظ پاکستان ہی کے جذبے کے تحت مشرف کا بھرپور ساتھ دیا تھا' لیکن صاف سیدھی اور کھری بات ہے کہ اس حوالہ سے انتہائی مخلص ہونے کے باوجود افواجِ پاکستان ماضی میں نہ صرف یہ کہ ملک کی خود مختاری اور سرحدوں کی حفاظت میں ناکام رہیں بلکہ آج تو صورت حال یہ ہے کہ ان کی اپنی عزت اور توقیر کی الیکٹرانک میڈیا پر دھجیاں اُڑائی جا رہی ہیں اور فوج بے بس نظر آ رہی ہے۔ یہاں تک کہ کور کمانڈرز کانفرنس کے اختتام پر انتہائی محتاط انداز میں کسی فوجی دبدبہ کے بغیر جو اعلامیہ جاری کیا گیا ٹی وی اینکرز نے اُسے بھی چٹکیوں میں اُڑا دیا۔ کیا کبھی کوئی تصور کر سکتا تھا کہ ایک این جی او کی سربراہ خاتون ٹی وی چینل پر ہاتھ جوڑ کر کہے گی کہ فوجیو! ہماری جان چھوڑ دو۔ یہی نہیں' بلکہ یہاں تک کہا گیا کہ یا پاکستان بچالو یا فوج بچالو۔ آپ الیکٹرانک میڈیا اور بعض سیاسی اور غیر سیاسی شخصیات پر ایک چھوڑ درجنوں الزامات لگا دیں۔ آیئے فرض کر لیں کہ آپ کے تمام الزامات صد فی صد درست ہیں۔ سوال یہ ہے کہ وجہ کچھ بھی ہو' بہرکیف آپ اپنی عزت اور ملک کی خود مختاری کے تحفظ میں ناکام تو ہوئے ہیں' یہ سب کے سامنے ہے اور اِس کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ آپ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ صورت حال کو exploit کیا جا رہا ہے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟ افواجِ پاکستان کو یہ دن کیوں دیکھنے پڑے؟ ہم ایک مثال سے بات سمجھانے کی کوشش کریں گے' اور وہ یہ کہ آپ کو ایک درخت سے بڑی محبت ہے' آپ اس کے تنے' اُس کی شاخوں اور پھل کی بڑی محنت' توجہ اور اخلاص سے حفاظت کر رہے ہیں' لیکن اُس کی جڑوں سے لاتعلق ہیں اور جس زمین پر وہ کھڑا ہے اُسے آپ نظرانداز کر رہے ہیں' تو ساری محنت سارے خلوص کے باوجود انجام کیا ہوگا' وہ نوشتہ دیوار ہے۔ ظاہر ہے بات آپ پر واضح ہوگئی ہوگی کہ پاکستان ایک نظریاتی ریاست ہے' اس کی نظریاتی بنیادوں کو نظرانداز کر کے اِس کی جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت ناممکن ہے۔ خدارا! اِس کو مولویوں کی بات کہہ کر نظرانداز نہ کریں۔ پاکستان اسلام کے نام پر معرضِ وجود میں آیا تھا۔ وہ اسلام

(باقی صفحہ 95 پر)

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُورۃُ الاعراف

تمہیدی کلمات

سورۃ الاعراف قرآن حکیم کی طویل ترین مکی سورت ہے۔ اس سورت کا سورۃ الانعام کے ساتھ چونکہ جوڑے کا تعلق ہے اس لیے اس کے مضامین کا تعارف سورۃ الانعام کے آغاز میں آ چکا ہے۔ سورۃ الاعراف کا زمانۂ نزول بھی تقریباً وہی ہے جو سورۃ الانعام کا ہے۔ سورۃ الانعام کے تعارف میں التذکیر بِآلاءِ اللّٰہ اور التذکیر بِاَیّامِ اللّٰہ کے فلسفے پر بھی تفصیلی بحث ہو چکی ہے اور دونوں سورتوں میں مضامین کی اس تقسیم کا ذکر بھی ہو چکا ہے کہ سورۃ الانعام میں تذکیر بِآلاءِ اللّٰہ پر زور ہے جب کہ سورۃ الاعراف میں تذکیر بِاَیّامِ اللّٰہ پر۔

سورۃ الاعراف کے موضوعات کی ترتیب اس طرح سے ہے کہ سب سے پہلے قصّہ آدم و ابلیس بیان کر کے انسانی تخلیق کے آغاز کا ذکر کیا گیا ہے۔ پھر حیاتِ دُنیوی کے اختتامی دور کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس اختتامی دَور میں تین اقسام کے لوگوں کی تفصیل آ گئی ہے۔ پہلے اہلِ جہنم کا تذکرہ ہے' اس کے بعد اہلِ جنت کا' اور پھر اصحابِ اعراف کا' یعنی وہ لوگ جن کے جنت یا دوزخ میں دخول کے بارے میں ابھی فیصلہ نہیں ہوا ہوگا۔ حیاتِ انسانی کی ابتدا اور اس کی انتہا کے تذکرے کے بعد حیاتِ انسانی کے ''درمیانی دَور'' کا تذکرہ تذکیر بِاَیّامِ اللّٰہ (انبیاء و رسل اور ان کی قوموں کے حالات) کے طور پر آ گیا ہے' جو اس سورت کے مضامین کا عمود (main theme) ہے۔ ان واقعات میں خاص طور پر اہلِ مکہ کے لیے اِنذار (تنبیہ اور ڈراوے) کا پہلو ہے کہ جو روش تم نے محمد رسول اللہ ﷺ کے مقابلے میں اختیار کر رکھی ہے ایسی ہی روش تم سے پہلے کی قومیں اپنے پیغمبروں کے مقابلے میں اختیار کر کے بہت برا انجام دیکھ چکی ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

آیات ۱ تا ۹

الٓمّٓصٓ ﴿۱﴾ کِتٰبٌ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ فَلَا یَکُنۡ فِیۡ صَدۡرِکَ حَرَجٌ مِّنۡہُ لِتُنۡذِرَ بِہٖ وَ ذِکۡرٰی لِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۲﴾ اِتَّبِعُوۡا مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکُمۡ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ وَ لَا تَتَّبِعُوۡا مِنۡ دُوۡنِہٖۤ اَوۡلِیَآءَ ؕ قَلِیۡلًا مَّا تَذَکَّرُوۡنَ ﴿۳﴾ وَ کَمۡ مِّنۡ قَرۡیَۃٍ اَہۡلَکۡنٰہَا فَجَآءَہَا بَاۡسُنَا بَیَاتًا اَوۡ ہُمۡ قَآئِلُوۡنَ ﴿۴﴾ فَمَا کَانَ دَعۡوٰىہُمۡ اِذۡ جَآءَہُمۡ بَاۡسُنَاۤ اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوۡۤا اِنَّا کُنَّا ظٰلِمِیۡنَ ﴿۵﴾ فَلَنَسۡـَٔلَنَّ الَّذِیۡنَ اُرۡسِلَ اِلَیۡہِمۡ وَ لَنَسۡـَٔلَنَّ الۡمُرۡسَلِیۡنَ ﴿۶﴾ فَلَنَقُصَّنَّ عَلَیۡہِمۡ بِعِلۡمٍ وَّ مَا کُنَّا غَآئِبِیۡنَ ﴿۷﴾ وَ الۡوَزۡنُ یَوۡمَئِذِ ۣ الۡحَقُّ ۚ فَمَنۡ ثَقُلَتۡ مَوَازِیۡنُہٗ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ﴿۸﴾ وَ مَنۡ خَفَّتۡ مَوَازِیۡنُہٗ فَاُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ خَسِرُوۡۤا اَنۡفُسَہُمۡ بِمَا کَانُوۡا بِاٰیٰتِنَا یَظۡلِمُوۡنَ ﴿۹﴾

آیت ۱ ﴿الٓمّٓصٓ ﴿۱﴾﴾ ''ا' ل' م' ص۔''

یہ حروفِ مقطعات ہیں' اور جیسا کہ پہلے بھی بیان ہو چکا ہے' حروفِ مقطعات کا حقیقی اور یقینی مفہوم کسی کو معلوم نہیں اور یہ کہ ان تمام حروف کے مفاہیم و مطالب اللہ اور اُس کے رسولؐ کے درمیان راز کا درجہ رکھتے ہیں۔ البتہ یہ نوٹ کر لیجیے کہ قرآن مجید کی دو سورتیں ایسی ہیں جن کے شروع میں چار چار حروف مقطعات آئے ہیں۔ ان میں سے ایک تو یہی سورۃ الاعراف ہے اور دوسری سورۃ الرعد' جس کا آغاز الٓمّٓرٰ سے ہو رہا ہے۔ اس سے پہلے تین حروفِ مقطعات (الٓمّٓ) سورۃ البقرۃ اور سورۂ آل عمران میں آ چکے ہیں۔

آیت ۲ ﴿کِتٰبٌ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ فَلَا یَکُنۡ فِیۡ صَدۡرِکَ حَرَجٌ مِّنۡہُ﴾ ''یہ کتاب ہے (اے نبی ﷺ) جو آپ پر نازل کی گئی ہے' تو نہیں ہونی چاہیے آپ کے دل میں کچھ تنگی اس کی وجہ سے''

رسول اللہ ﷺ دعوت کے لیے ہر ممکن طریقہ استعمال کر رہے تھے' مگر آپؐ کی سالہا

سال کی جدّوجُہد کے باوجود مکّہ کے صرف چند لوگ ایمان لائے۔ یہ صورتِ حال آپ ﷺ کے لیے باعثِ تشویش تھی۔ ایک عام آدمی تو اپنی غلطیوں کی ذمہ داری بھی دوسروں کے سر پر ڈالنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنی کوتاہیوں کو بھی دوسروں کے کھاتے میں ڈال کر خود کو صاف بچانے کی فکر میں رہتا ہے' لیکن ایک شریف النفس انسان ہمیشہ یہ دیکھتا ہے کہ اگر اس کی کوشش کے خاطر خواہ نتائج سامنے نہیں آ رہے ہیں تو اس میں اُس کی طرف سے کہیں کوئی کوتاہی تو نہیں ہو رہی۔ اس سوچ اور احساس کی وجہ سے وہ اپنے دل پر ہر وقت ایک بوجھ محسوس کرتا ہے۔ لہٰذا جب حضور ﷺ کی مسلسل کوشش کے باوجود اہلِ مکہ ایمان نہیں لا رہے تھے تو بشری تقاضے کے تحت آپؐ کو دل میں بہت پریشانی محسوس ہوتی تھی۔ اس لیے آپؐ کی تسلی کے لیے فرمایا جا رہا ہے کہ اس قرآن کی وجہ سے آپؐ کے اوپر کوئی تنگی نہیں ہونی چاہیے۔

﴿لِتُنْذِرَ بِهٖ وَذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝۲﴾ ''(یہ تو اس لیے ہے) تاکہ اس کے ذریعے سے آپؐ خبردار کریں اور یہ یاددہانی ہے اہلِ ایمان کے لیے۔''

''لِتُنْذِرَ بِهٖ'' وہی لفظ ہے جو ہم سورۃ الانعام کی آیت ۱۹ میں بھی پڑھ آئے ہیں۔ وہاں فرمایا گیا تھا: ﴿وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ﴾ ''اور یہ قرآن میری طرف اس لیے وحی کیا گیا ہے کہ اس کے ذریعے سے تمہیں بھی خبردار کروں اور جس جس کو یہ پہنچے''۔ یہاں مزید فرمایا کہ یہ اہلِ ایمان کے لیے ذِکْرٰی (یاددہانی) ہے۔ یعنی جن سلیم الفطرت لوگوں کے اندر بالقُوّۃ (potentially) ایمان موجود ہے اُن کے اِس سوئے ہوئے (dormant) ایمان کو بیدار (activate) کرنے کے لیے یہ کتاب ایک طرح سے یاددہانی ہے۔ جیسے آپ کو کوئی چیز بھول گئی تھی' اچانک کہیں اس کی کوئی نشانی دیکھی تو فوراً وہ شے یاد آ گئی' اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی معرفت کے حصول کے لیے اس کائنات کی نشانیوں کو یاددہانی (ذکریٰ) بنا دیا ہے۔

آیت ۳ ﴿اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ ''پیروی کرو اُس کی جو نازل کیا گیا تمہاری طرف تمہارے ربّ کی جانب سے''

پچھلی آیت میں حضور ﷺ سے صیغہ واحد میں خطاب تھا ﴿فَلَا يَكُنْ فِيْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ﴾ جب کہ یہاں ''اِتَّبِعُوْا'' جمع کا صیغہ ہے۔ یعنی یہاں خطاب کا رخ عام لوگوں کی طرف ہے اور انہیں وحیٔ الٰہی کی پیروی کا حکم دیا جا رہا ہے۔

﴿وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۝۳﴾ ''اور مت پیروی کرو اُس کے سوا دوسرے سرپرستوں کی۔ کم ہی ہے جو نصیحت تم حاصل کرتے ہو۔''

یعنی اپنے ربّ کو چھوڑ کر کچھ دوسرے اولیاء (دوست' سرپرست) بنا کر ان کی پیروی مت کرو۔

آیت ۴ ﴿وَكَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا فَجَاۗءَهَا بَاْسُنَا بَيَاتًا اَوْ هُمْ قَاۗىِٕلُوْنَ ۝۴﴾ ''اور کتنی ہی بستیاں ایسی ہیں جنہیں ہم نے ہلاک کر دیا' تو ان پر آ پڑا ہمارا عذاب جب وہ رات کو سو رہے تھے یا جب دوپہر کو قیلولہ کر رہے تھے۔''

چونکہ اس سورۂ مبارکہ کے موضوع کا عمود تذکیر بِاَیّٰمِ اللّٰہ ہے' لہٰذا شروع میں ہی اقوامِ گزشتہ پر عذاب اور ان کی بستیوں کی تباہی کا تذکرہ آ گیا ہے۔ یہ قومِ نوحؑ' قومِ ہودؑ' قومِ صالحؑ' قومِ ثمودؑ اور قومِ شعیبؑ کی بستیوں اور عامورہ اور سدوم کے شہروں کی طرف اشارہ ہے۔

آیت ۵ ﴿فَمَا كَانَ دَعْوٰىهُمْ اِذْ جَاۗءَهُمْ بَاْسُنَآ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۝۵﴾ ''تو پھر ان کی پکار اس کے سوا کچھ نہیں تھی جب ان پر ہمارا عذاب آ پڑا کہ (ہائے ہماری شامت) بے شک ہم ہی ظالم تھے۔''

واقعتاً ہمارے رسولوں نے تو ہماری آنکھیں کھولنے کی پوری کوشش کی تھی مگر ہم نے ہی اپنی جانوں پر زیادتی کی جو ان کی دعوت کو نہ مانا۔

آیت ۶ ﴿فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ۝۶﴾ ''پس ہم لازماً پوچھ کر رہیں گے ان سے بھی جن کی طرف ہم نے رسولوں کو بھیجا اور لازماً پوچھ کر رہیں گے رسولوں سے بھی۔''

یہ فلسفۂ رسالت کا بہت اہم موضوع ہے جو اس آیت میں بڑی جلالی شان کے ساتھ آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی قوم کی طرف رسول کو اس لیے بھیجتا ہے تاکہ وہ اسے خبردار کر دے۔ یہ ایک بہت بھاری اور حسّاس ذمہ داری ہے جو رسول پر ڈالی جاتی ہے۔ اب اگر بالفرض رسول کی طرف سے اس میں ذرا بھی کوتاہی ہو گی تو قوم سے پہلے اس کی پکڑ ہو جائے گی۔ اس کی مثال یوں ہے کہ آپ نے ایک اہم پیغام دے کر کسی آدمی کو اپنے کسی دوست کے پاس بھیجا کہ وہ یہ کام کل تک ضرور کر دے ورنہ بہت نقصان ہو گا' لیکن آپ کے اس دوست نے وہ کام نہیں کیا

اور آپ کا نقصان ہو گیا۔ اب آپ غصّے سے آگ بگولہ اپنے دوست کے پاس پہنچے اور کہا کہ تم نے میرے پیغام کے مطابق بروقت میرا کام کیوں نہیں کیا؟ اب آپ کا دوست اگر جواباً یہ کہہ دے کہ اس کے پاس تو آپ کا پیغام لے کر کوئی آیا ہی نہیں تو اپنے دوست سے آپ کی ناراضی فوراً ختم ہو جائے گی‘ کیونکہ اس نے کوتاہی نہیں کی‘ اور آپ کو شدید غصہ اس شخص پر آئے گا جس کو آپ نے پیغام دے کر بھیجا تھا۔ اب آپ اس سے باز پرس کریں گے کہ تم نے میرا اتنا اہم پیغام کیوں نہیں پہنچایا؟ تم نے غیر ذمّہ داری کا ثبوت دے کر میرا اتنا بڑا نقصان کر دیا۔ اسی طرح کا معاملہ ہے اللہ‘ رسول اور قوم کا۔ اللہ نے رسول کو پیغام بر بنا کر بھیجا۔ بالفرض اس پیغام کے پہنچانے میں رسول سے کوتاہی ہو جائے تو وہ جوابدہ ہوگا۔ ہاں اگر وہ پیغام پہنچا دے تو پھر وہ اپنی ذمّہ داری سے بَری ہو جائے گا۔ پھر اگر قوم اس پیغام پر عمل درآمد نہیں کرے گی تو وہ ذمہ دار ٹھہرے گی۔ چنانچہ آخرت میں اُمتوں کا بھی محاسبہ ہونا ہے اور رسولوں کا بھی۔ اُمت سے جواب طلبی ہوگی کہ میں نے تمہاری طرف اپنا رسول بھیجا تھا تا کہ وہ تمہیں میرا پیغام پہنچا دے‘ تم نے اس پیغام کو قبول کیا یا نہیں کیا؟ اور مرسلین سے یہ پوچھا جائے گا کہ تم نے میرا پیغام پہنچایا یا نہیں؟ اس کی ایک جھلک ہم سورۃ المائدۃ (آیت ۱۰۹) میں ﴿مَاذَآ اُجِبْتُمْ﴾ کے سوال میں اور پھر اللہ تعالیٰ کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ قیامت کے دن ہونے والے مکالمے کے ان الفاظ میں بھی دیکھ آئے ہیں: ﴿وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ (آیت ۱۱۶) ’’اور جب اللہ پوچھے گا کہ اے عیسیٰ ابن مریم کیا تم نے کہا تھا لوگوں سے کہ مجھے اور میری ماں کو بھی الٰہ بنا لینا اللہ کے علاوہ؟‘‘

اب ذرا حجۃ الوداع (۱۰ ہجری) کے منظر کو ذہن میں لائیے۔ محمد رسول اللہ ﷺ ایک جمِ غفیر سے مخاطب ہیں۔ اس تاریخی موقع کے پس منظر میں آپ ﷺ کی ۲۳ برس کی محنتِ شاقہ تھی‘ جس کے نتیجے میں آپ ﷺ نے جزیرہ نمائے عرب کے لوگوں پر اتمامِ حجت کر کے دین کو غالب کر دیا تھا۔ لہٰذا آپ ﷺ نے اس مجمع کو مخاطب کر کے فرمایا: ((اَلَا هَلْ بَلَّغْتُ؟)) لوگو سنو! کیا میں نے پہنچا دیا؟ اس پر پورے مجمع نے یک زبان ہو کر جواب دیا: نَشْهَدُ اَنَّكَ قَدْ بَلَّغْتَ وَاَدَّيْتَ وَنَصَحْتَ[1]۔ ایک روایت میں الفاظ آتے ہیں: اِنَّا نَشْهَدُ اَنَّكَ قَدْ بَلَّغْتَ الرِّسَالَةَ وَاَدَّيْتَ الْاَمَانَةَ وَنَصَحْتَ الْاُمَّةَ وَكَشَفْتَ الْغُمَّةَ کہ ہاں ہم گواہ ہیں

(۱) صحیح مسلم‘ کتاب الحج‘ باب حجة النبی ﷺ۔ وسنن ابی داؤد‘ کتاب المناسك‘ باب صفة حجة النبی ﷺ۔

آپ ﷺ نے رسالت کا حق ادا کر دیا‘ آپؐ نے امانت کا حق ادا کر دیا (یہ قرآن آپؐ کے پاس اللہ کی امانت تھی جو آپؐ نے ہم تک پہنچا دی)‘ آپؐ نے اُمت کی خیر خواہی کا حق ادا کر دیا اور آپؐ نے گمراہی اور ضلالت کے اندھیروں کا پردہ چاک کر دیا۔ حضور ﷺ نے تین دفعہ یہ سوال کیا اور تین دفعہ جواب لیا اور تینوں دفعہ انگشتِ شہادت آسمان کی طرف اٹھا کر پکارا: اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ! اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ! اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ! اے اللہ تو بھی گواہ رہ‘ یہ مان رہے ہیں کہ میں نے تیرا پیغام انہیں پہنچا دیا۔ اور پھر فرمایا: ((فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ))[2] کہ اب پہنچائیں وہ لوگ جو یہاں موجود ہیں ان لوگوں کو جو یہاں موجود نہیں ہیں۔ گویا میرے کندھے سے یہ بوجھ اتر کر اب تمہارے کندھوں پر آ گیا ہے۔ اگر میں صرف تمہاری طرف رسول بن کر آیا ہوتا تو بات آج پوری ہو گئی ہوتی‘ مگر میں تو رسول ہوں تمام انسانوں کے لیے جو قیامت تک آئیں گے۔ چنانچہ اب اس دعوت اور تبلیغ کو ان لوگوں تک پہنچانا امّت کے ذمّہ ہے۔ یہی وہ گواہی ہے جس کا منظر سورۃ النساء میں دکھایا گیا ہے: ﴿فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ﴿۴۱﴾﴾۔ پھر اس روز حجۃ الوداع کے موقع والی گواہی کا حوالہ بھی آئے گا کہ اے اللہ میں نے تو ان لوگوں کو تیرا پیغام پہنچا دیا تھا‘ اب یہ ذمہ دار اور جواب دہ ہیں۔ چونکہ معاملہ ان پر کھول دیا گیا تھا‘ لہٰذا اب یہ لوگ لاعلمی کے بہانے کا سہارا نہیں لے سکتے۔

آیت ۷ ﴿فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَّمَا كُنَّا غَآئِبِيْنَ ﴿۷﴾﴾ ’’پھر ہم ان کے سامنے احوال بیان کریں گے علم کی بنیاد پر اور ہم کہیں غائب تو نہیں تھے۔‘‘

اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں کس قدر جدّوجہد کر رہے تھے اور آپؐ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کس طرح کے مشکل حالات میں آپؐ کا ساتھ دے رہے تھے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ ابوجہل اور ابولہب کی کارروائیوں کو بھی دیکھ رہا تھا کہ وہ کس کس طریقے سے حضور ﷺ کو اذیتیں پہنچا رہے تھے اور اسلام کی مخالفت کر رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ قیامت کے دِن ہم ان کے سامنے اپنے علم کی بنیاد پر تمام احوال بیان کر دیں گے‘ کیونکہ جب یہ سب کچھ ہو رہا تھا تو ہم وہاں سے غیر حاضر تو نہیں تھے۔ سورۃ الحدید (آیت ۴) میں اس حقیقت کو اس طرح بیان کیا گیا ہے: ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ﴾ کہ وہ

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب الحج‘ باب الخطبة ایام منٰی۔ وصحیح مسلم‘ کتاب القسامة والمحاربین والقصاص والدیات‘ باب تغلیظ تحریم الدماء والاعراض والاموال۔

(اللہ) تمہارے ساتھ ہی ہوتا ہے جہاں کہیں بھی تم ہوتے ہو۔

آیت ۸ ﴿وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ ِالْحَقُّ ۚ﴾ ''اور اُس روز وزن ہوگا حق ہی میں (یا وزن ہی فیصلہ کن ہوگا)''

اُس روز اللہ تعالیٰ ترازو نما کوئی ایسا نظام قائم کرے گا' جس کے ذریعے سے اعمال کا ٹھیک ٹھیک وزن ہوگا' مگر اُس دن وزن صرف حق ہی میں ہوگا' یعنی صرف اعمالِ صالحہ ہی کا وزن ہوگا' باطل اور بُرے کاموں میں سرے سے کوئی وزن نہیں ہوگا' ریاکاری کی نیکیاں ترازو میں بالکل بے حیثیت ہوں گی۔ ﴿وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ ِالْحَقُّ ۚ﴾ کا دوسرا مفہوم یہ بھی ہے کہ اُس دن وزن ہی حق ہوگا' وزن ہی فیصلہ کن ہوگا۔ اگر دو پلڑوں والی ترازو کا تصور کریں تو جس کا نیکیوں والا پلڑا بھاری ہوگا نجات بس اسی کے لیے ہوگی۔

﴿فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۸﴾ ''تو جس کے پلڑے بھاری ہوں گے تو وہی ہوں گے فلاح پانے والے۔''

آیت ۹ ﴿وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ ۝۹﴾ ''اور جس کے پلڑے ہلکے ہوں گے تو یہی وہ لوگ ہوں گے جنہوں نے اپنے آپ کو ہلاک کرلیا بسبب اس کے کہ وہ ہماری آیات سے ناانصافی کرتے رہے۔''

آیت ۶ ﴿فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ۝۶﴾ کی طرح اگلی آیت بھی اپنے موضوع کے اعتبار سے بہت اہم ہے۔

آیات ۱۰ تا ۲۵

وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝۱۰ وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰۗىِٕكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ ۡ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ۝۱۱ قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ۭ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ۝۱۲ قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ ۝۱۳ قَالَ اَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۝۱۴ قَالَ اِنَّكَ مِنَ

الْمُنْظَرِيْنَ ۝۱۵ قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝۱۶ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَاۗىِٕلِهِمْ ۭ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ۝۱۷ قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۭ لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَاَمْلَــَٔنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝۱۸ وَيٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۱۹ فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وٗرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا وَقَالَ مَا نَهٰىكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ ۝۲۰ وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ ۝۲۱ فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ ۚ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۭ وَنَادٰىهُمَا رَبُّهُمَآ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَاَقُلْ لَّكُمَآ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝۲۲ قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ۫ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝۲۳ قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ۝۲۴ قَالَ فِيْهَا تَحْيَوْنَ وَفِيْهَا تَمُوْتُوْنَ وَمِنْهَا تُخْرَجُوْنَ ۝۲۵ ع

آیت ۱۰ ﴿وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝۱۰﴾ ''اور (دیکھو انسانو!) ہم نے تمہیں زمین میں تمکّن عطا فرمایا اور اس میں تمہارے لیے معاش کے سارے سامان رکھ دیے' (لیکن) بہت ہی کم ہے جو شکر تم کرتے ہو۔''

تم لوگوں کو تو ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ زمین کے وسائل انسان کے مسلسل استعمال سے ختم نہ ہو جائیں' انسانی و حیوانی خوراک کا قحط نہ پڑ جائے۔ مگر تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ کے خزانے ختم ہونے والے نہیں ہیں۔ ہم نے تمہیں اس زمین میں بسایا ہے تو یہاں تمہارے معاش کا پورا پورا بندوبست بھی کیا ہے۔ اِس دُنیوی زندگی میں تمہاری اور تمہاری آئندہ نسلوں

کی ہر قسم کی جسمانی ضرورتیں یہیں سے پوری ہوں گی۔ اس موضوع کی اہمیت کے پیش نظر اگلے (دوسرے) رکوع میں بھی اسی مضمون یعنی تمکّن فی الارض کی تفصیل بیان ہوئی ہے۔

آیت ۱۱ ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ ۖ﴾ ''اور ہم نے تمہیں تخلیق کیا' پھر تمہاری تصویر کشی کی' پھر ہم نے کہا فرشتوں سے کہ جھک جاؤ آدم کے سامنے''

نظریۂ ارتقاء (Evolution Theory) کے حامی اس آیت سے بھی کسی حد تک اپنی نظریاتی غذا حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ قرآن حکیم میں انسان کی تخلیق کے مختلف مراحل کے بارے میں مختلف نوعیت کی تفصیلات ملتی ہیں۔ ایک طرف تو انسان کو مٹی سے پیدا کرنے کی بات کی گئی ہے۔ مثلاً سورۂ آل عمران آیت ۵۹ میں بتایا گیا ہے کہ انسانِ اوّل کو مٹی سے بنا کر کُنْ کہا گیا تو وہ ایک زندہ انسان بن گیا (فَیَکُوْنُ)۔ یعنی یہ آیت ایک طرح سے انسان کی ایک خاص مخلوق کے طور پر تخلیق کی تائید کرتی ہے۔ جب کہ آیت زیر نظر میں اس ضمن میں تدریجی مراحل کا ذکر ہوا ہے۔ یہاں جمع کے صیغے (وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ) سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اس سلسلہ کی کچھ انواع (species) پہلے پیدا کی گئی تھیں۔ گویا نسل انسانی پہلے پیدا کی گئی' پھر ان کی شکل وصورت کو finishing touches دیے گئے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آدم تو ایک تھا' پھر یہ جمع کے صیغے کیوں استعمال ہو رہے ہیں؟ اس سوال کے جواب کے لیے سورۂ آلِ عمران کی آیت ۳۳ بھی ایک طرح سے ہمیں دعوتِ غور وفکر دیتی ہے' جس میں فرمایا گیا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو بھی اللہ تعالیٰ نے چنا تھا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝۳۳﴾۔ گویا یہ آیت بھی کسی حد تک ارتقائی عمل کی طرف اشارہ کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ بہرحال اس قسم کی theories کے بارے میں جیسے جیسے جو جو علمی اشارے دستیاب ہوں ان کو اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے' اور آنے والے وقت کے لیے اپنے options کھلے رکھنے چاہئیں۔ ہوسکتا ہے جب وقت کے ساتھ ساتھ کچھ مزید حقائق اللہ تعالیٰ کی حکمت اور مشیت سے انسانی علم میں آئیں تو ان آیات کے مفاہیم زیادہ واضح ہو کر سامنے آجائیں۔

﴿فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ۝۱۱﴾ ''تو سجدہ کیا سب نے سوائے ابلیس کے' نہ ہوا وہ سجدہ کرنے والوں میں۔''

آیت ۱۲ ﴿قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ۭ﴾ ''(اللہ تعالیٰ نے) فرمایا کس چیز نے تمہیں روکا کہ تم نے سجدہ نہیں کیا' جب کہ میں نے تمہیں حکم دیا تھا۔''

﴿قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ۝۱۲﴾ ''اُس نے کہا میں اِس سے بہتر ہوں' مجھے تُو نے بنایا ہے آگ سے اور اس کو بنایا ہے مٹی سے۔''

اس نے اپنے استکبار کی بنیاد پر ایسا کہا۔ یہاں اس کا جو قول نقل کیا گیا ہے اس کے ایک ایک لفظ سے تکبر جھلکتا ہے۔

آیت ۱۳ ﴿قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ ۝۱۳﴾ ''(اللہ تعالیٰ نے) فرمایا پس اُتر جاؤ اس سے' تمہیں یہ حق نہیں تھا کہ تم اس میں تکبّر کرو' پس نکل جاؤ' یقیناً تم ذلیل وخوار ہو۔''

آیت ۱۴ ﴿قَالَ اَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۝۱۴﴾ ''اُس نے کہا (اے اللہ) مجھے مہلت دے اُس دن تک جس دن انہیں (زندہ کر کے) اٹھایا جائے گا۔''

آیت ۱۵ ﴿قَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ۝۱۵﴾ ''فرمایا (ٹھیک ہے جاؤ) تمہیں مہلت دی گئی۔''

آیت ۱۶ ﴿قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝۱۶﴾ ''اُس نے کہا (پروردگار!) تو نے جو مجھے (آدم کی وجہ سے) گمراہ کیا ہے تو اب میں لازماً ان کے لیے گھات میں بیٹھوں گا تیری سیدھی راہ پر۔''

تیری توحید کی شاہراہ پر ڈیرے جما کر' گھات لگا کر' مورچہ بند ہو کر بیٹھوں گا اور تیرے بندوں کو شرک کی پگڈنڈیوں کی طرف موڑتا رہوں گا۔

آیت ۱۷ ﴿ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَاۗئِلِهِمْ ۭ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ۝۱۷﴾ ''پھر میں ان پر حملہ کروں گا ان کے سامنے سے اور ان کے پیچھے سے' اور ان کے دائیں اور بائیں جانب سے' اور تو نہیں پائے گا ان کی اکثریت کو شکر کرنے والا۔''

آیت ۱۸ ﴿قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۭ لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ

مِنۡكُمۡ اَجۡمَعِيۡنَ ﴿۱۸﴾ ’’(اللہ تعالیٰ نے) فرمایا نکل جاؤ اس میں سے بُرے حال میں مردود ہو کر۔ ان میں سے جو تیری پیروی کریں گے تو میں (انہیں اور تم کو اکٹھا کر کے) تم سب سے جہنم کو بھر کر رہوں گا۔‘‘

آیت ۱۹ ﴿وَيٰۤاٰدَمُ اسۡكُنۡ اَنۡتَ وَزَوۡجُكَ الۡجَنَّةَ فَكُلَا مِنۡ حَيۡثُ شِئۡتُمَا وَلَا تَقۡرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوۡنَا مِنَ الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۱۹﴾ ’’اور (پھر ہم نے آدم سے کہا کہ) اے آدمؑ رہو جنت میں تم اور تمہاری بیوی‘ اور کھاؤ پیو اس میں سے جہاں سے تم دونوں چاہو‘ اور (ہاں) اس درخت کے قریب مت جانا‘ ورنہ تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔‘‘

آیت ۲۰ ﴿فَوَسۡوَسَ لَهُمَا الشَّيۡطٰنُ لِيُبۡدِىَ لَهُمَا مَا وٗرِىَ عَنۡهُمَا مِنۡ سَوۡاٰتِهِمَا﴾ ’’تو شیطان نے ان دونوں کو وسوسہ میں ڈالا تا کہ ظاہر کر دے ان پر جو ان سے پوشیدہ تھیں ان کی شرمگاہیں‘‘

قصۂ آدمؑ و ابلیس کی تفصیل ہم سورۃ البقرۃ کے چوتھے رکوع میں بھی پڑھ چکے ہیں۔ یہاں یہ قصہ دوسری مرتبہ بیان ہوا ہے۔ پورے قرآن مجید میں یہ واقعہ سات مرتبہ آیا ہے‘ چھ مرتبہ مکی سورتوں میں اور ایک مرتبہ مدنی سورت (البقرۃ) میں۔ لیکن ہر جگہ مختلف انداز سے بیان ہوا ہے اور ہر بار کسی نہ کسی نئی بات کا اس میں اضافہ ہوا ہے۔ حضور ﷺ کی دعوتی تحریک جیسے جیسے آگے بڑھ رہی تھی‘ ہر دور کے مخصوص حالات کے سبب اس واقعے میں ہر دفعہ مزید تفصیلات شامل ہوتی گئیں۔ اس رکوع کے شروع میں جب اس قصے کا ذکر آیا ہے تو وہاں جمع کا صیغہ استعمال کر کے تمام انسانوں کو مخاطب کیا گیا ہے: ﴿وَلَقَدۡ خَلَقۡنٰكُمۡ ثُمَّ صَوَّرۡنٰكُمۡ ثُمَّ قُلۡنَا لِلۡمَلٰٓئِكَةِ اسۡجُدُوۡا لِاٰدَمَ ۖ فَسَجَدُوۡۤا اِلَّاۤ اِبۡلِيۡسَ ؕ﴾

سورۃ البقرۃ کی متعلقہ آیات کی وضاحت کرتے ہوئے اس ضمن میں بعض اہم نکات زیر بحث آ چکے ہیں۔ یہاں پر مزید کچھ باتیں تشریح طلب ہیں۔ ایک تو شیطان کے حضرت آدم اور حضرت حوا علیہما السلام کو ورغلانے اور ان کے دلوں میں وسوسے ڈالنے کا سوال ہے کہ اس کی کیفیت کیا تھی۔ اس سلسلے میں جو باتیں یا مکالمات قرآن میں آئے ہیں ان سے یہ گمان ہرگز نہ کیا جائے کہ وہ اسی طرح ان کے درمیان وقوع پذیر بھی ہوئے تھے اور وہ ایک دوسرے کو دیکھتے اور پہچانتے ہوئے ایک دوسرے سے باتیں کرتے تھے۔ ایسا ہرگز نہیں تھا‘ بلکہ شیطان

جیسے آج ہماری نگاہوں سے پوشیدہ ہے اسی طرح حضرت آدمؑ اور حضرت حوا کی نظروں سے بھی پوشیدہ تھا اور جس طرح آج ہمارے دلوں میں شیطانی وسوسے جنم لیتے ہیں اسی طرح ان کے دلوں میں بھی وسوسے پیدا ہوئے تھے۔ دوسرا اہم نکتہ ایک خاص ممنوعہ پھل کے چکھنے اور اس کی ایک خاص تاثیر کے بارے میں ہے۔ قرآن مجید میں ہمیں اس کی تفصیل اس طرح ملتی ہے کہ اس پھل کے چکھنے پر ان کی شرمگاہیں نمایاں ہو گئیں۔ جہاں تک اس کیفیت کی حقیقت کا تعلق ہے تو اسے معلوم کرنے کے لیے ہمارے پاس حتمی اور قطعی علمی ذرائع نہیں ہیں‘ اس لیے اسے متشابہات میں ہی شمار کیا جائے گا۔ البتہ اس کے بارے میں مفسرین نے قیاس آرائیاں کی ہیں۔ مثلاً یہ کہ پہلے انہیں اپنے اِن اعضاء کے بارے میں شعور نہیں تھا‘ مگر وہ پھل چکھنے کے بعد یہ شعور ان میں بیدار ہو گیا‘ یا یہ کہ پہلے انہیں جنت کا لباس دیا گیا تھا جو اس واقعے کے بعد اتر گیا۔ بعض لوگوں کے نزدیک یہ نیکی اور بدی کا درخت تھا جس کا پھل کھاتے ہی ان میں نیکی اور بدی کی تمیز پیدا ہو گئی۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ یہ دراصل آدمؑ اور حواؑ کے درمیان پہلا جنسی اختلاط (sexual act) تھا‘ جسے اس انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ مختلف آراء ہیں‘ لیکن صحیح بات یہی ہے کہ یہ متشابہات میں سے ہے اور ٹھوس علمی معلومات کے بغیر اس کے بارے میں کوئی قطعی اور حقیقی رائے قائم کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے کہ وہ درخت کون سا تھا اور اسے چکھنے کی اصل حقیقت اور کیفیت کیا تھی۔

﴿وَقَالَ مَا نَهٰىكُمَا رَبُّكُمَا عَنۡ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّاۤ اَنۡ تَكُوۡنَا مَلَكَيۡنِ اَوۡ تَكُوۡنَا مِنَ الۡخٰلِدِيۡنَ ﴿۲۰﴾ ’’اور اُس نے کہا (وسوسہ اندازی کی) کہ نہیں روکا ہے آپ دونوں کو آپ کے رب نے اس درخت سے مگر اسی لیے کہ کہیں آپ فرشتے نہ بن جائیں یا کہیں ہمیشہ ہمیشہ رہنے والے نہ ہو جائیں۔‘‘

یہ تو سیدھی سی بات ہے کہ فرشتوں کو تو آدمؑ کے سامنے جھکایا گیا تھا تو اس کے بعد آپؑ کے لیے فرشتہ بن جانا کون سی بڑی بات تھی‘ لیکن بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ انسان کو نسیان ہو جاتا ہے اور وہ اپنی اصل حقیقت‘ اصل مقام کو بھول جاتا ہے۔ چنانچہ یہ بات گویا شیطان نے وسوسے کے انداز سے ان کے ذہنوں میں ڈالنے کی کوشش کی کہ اس شجر ممنوعہ کا پھل کھا کر تم فرشتے بن جاؤ گے یا ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہو گے اور تم پر موت طاری نہ ہو گی۔

آیت ۲۱ ﴿وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّیْ لَکُمَا لَمِنَ النّٰصِحِیْنَ ﴿۲۱﴾﴾ ’’اور اس نے قسمیں کھا کھا کر اُن کو یقین دلایا کہ میں آپ دونوں کے لیے بہت ہی خیر خواہ ہوں۔‘‘

آیت ۲۲ ﴿فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ ۚ﴾ ’’تو اُس نے دھوکہ دے کر انہیں مائل کر ہی لیا۔‘‘

﴿فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۭ﴾ ’’تو جب ان دونوں نے چکھ لیا اس درخت کے پھل کو تو ظاہر ہو گئیں ان پر ان کی شرمگاہیں اور وہ لگے گانٹھنے جنت کے (درختوں کے) پتّوں کو اپنے اوپر (لباس بنانے کے لیے)‘‘

اپنی عریانی کا احساس ہونے کے بعد وہ جنت کے درختوں کے پتوں کو آپس میں سی کر یا جوڑ کر اپنے اپنے ستر کو چھپانے کا اہتمام کرنے لگے۔

﴿وَنَادٰىهُمَا رَبُّهُمَآ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَاَقُلْ لَّكُمَآ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۲۲﴾﴾ ’’اور اب آواز دی ان دونوں کو ان کے رب نے کہ کیا میں نے تمہیں منع نہیں کیا تھا اس درخت سے اور کیا میں نے تم سے کہا نہیں تھا کہ شیطان تم دونوں کا کھلا دشمن ہے۔‘‘

آیت ۲۳ ﴿قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ۫ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۲۳﴾﴾ ’’(اس پر) وہ دونوں پکار اُٹھے کہ اے ہمارے رب ہم نے ظلم کیا اپنی جانوں پر، اور اگر تو نے ہمیں معاف نہ فرمایا اور ہم پر رحم نہ فرمایا تو ہم تباہ ہونے والوں میں سے ہو جائیں گے۔‘‘

یعنی ہم اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہیں کہ ہم نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے۔ یہ وہی کلمات ہیں جن کے بارے میں ہم سورۃ البقرۃ (آیت ۳۷) میں پڑھ آئے ہیں: ﴿فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ۭ﴾ یعنی آدمؑ نے اپنے رب سے کچھ کلمات سیکھ لیے اور ان کے ذریعے سے معافی مانگی تو اللہ نے اس کی توبہ قبول کر لی۔ وہاں اس ضمن میں صرف اشارہ کیا گیا تھا، یہاں وہ کلمات بتا دیے گئے ہیں۔ اس سارے واقعے میں ایک اہم بات یہ بھی قابل غور ہے کہ قرآن میں کہیں بھی کوئی ایسا اشارہ نہیں ملتا جس سے یہ ثابت ہو کہ ابلیس نے یہ وسوسہ ابتدا میں اماں حوّا کے دل میں ڈالا تھا۔ اس سلسلے میں عام طور پر ہمارے ہاں جو کہانیاں

موجود ہیں ان کی رو سے شیطان کے بہکاوے میں پہلے حضرت حوا آئیں اور پھر وہ حضرت آدمؑ کو گمراہ کرنے کا ذریعہ بنیں۔ لیکن قرآن اس امکان کی نفی کرتا ہے۔ آیات زیر نظر کے مطالعے سے تو ان دونوں کا بہکاوے میں آ جانا بالکل واضح ہو جاتا ہے کیونکہ یہاں قرآن مسلسل تثنیہ کا صیغہ استعمال کر رہا ہے۔ یعنی شیطان نے ان دونوں کو ورغلایا، دونوں اس کے بہکاوے میں آ گئے اور پھر دونوں نے اللہ سے معافی مانگی اور اللہ نے دونوں کو معاف کر دیا۔

حضرت حوّا کے شیطان کے بہکاوے میں آنے والی کہانیوں کی ترویج دراصل عیسائیت کے زیر اثر ہوئی ہے۔ عیسائیت میں عورت کو گناہ اور برائی کی جڑ سمجھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ Eve (حوا) سے لفظ evil ان کے ہاں برائی کا ہم معنی قرار پایا ہے۔ عیسائیت میں شادی کرنا اور عورت سے قربت کا تعلق ایک گھٹیا فعل تصور کیا جاتا تھا، جبکہ تجرد کی زندگی گزارنا اور رہبانیت کے طور طریقوں کو ان کے ہاں روحانیت کی معراج سمجھا جاتا تھا۔ نتیجتاً ان کے ہاں اس طرح کی کہانیوں نے جنم لیا، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آدمؑ کو جنت سے نکلوانے اور ان کی آزمائشوں اور مصیبتوں کا باعث بننے والی دراصل ایک عورت تھی۔ بہرحال ایسے تصورات اور نظریات کی تائید قرآن مجید سے نہیں ہوتی۔

آیت ۲۴ ﴿قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ﴾ ’’(اللہ نے) فرمایا تم سب اُتر جاؤ (اب) تم ایک دوسرے کے دشمن ہو۔‘‘

ھُبُوط کے بارے میں سورۃ البقرۃ آیت ۳۶ میں وضاحت ہو چکی ہے کہ یہ لفظ صرف بلندی سے نیچے اترنے کے معنی کے لیے ہی خاص نہیں بلکہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کا مفہوم بھی اس میں شامل ہے۔ جس دشمنی کا ذکر یہاں کیا گیا وہ حضرت آدم کے ہبوطِ ارضی کے وقت سے آج تک شیطان کی ذرّیت اور آدمؑ کی اولاد کے درمیان مسلسل چلی آ رہی ہے اور قیامت تک چلتی رہے گی۔ اس کے علاوہ اس سے بنی نوع انسان کی باہمی دشمنیاں بھی مراد ہیں جو مختلف افراد اور اقوام کے درمیان پائی جاتی ہیں۔

﴿وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۲۴﴾﴾ ’’اور تمہارے لیے زمین میں ٹھکانہ ہے اور (ضرورت کا) ساز و سامان بھی ایک وقت معیّن تک۔‘‘

یہ ٹھکانہ اور مال و متاع ابدی نہیں ہے، بلکہ ایک خاص وقت تک کے لیے ہے۔ اب تمہیں اس زمین پر رہنا بسنا ہے اور وہاں رہنے بسنے کے لیے جو چیزیں ضروری ہیں وہ وہاں پر فراہم

کر دی گئی ہیں۔

آیت ۲۵ ﴿قَالَ فِيْهَا تَحْيَوْنَ وَفِيْهَا تَمُوْتُوْنَ وَمِنْهَا تُخْرَجُوْنَ ۝۲۵﴾ ''پھر فرمایا کہ (اب) تم اسی (زمین) میں زندگی گزارو گے' اسی میں مرو گے اور اسی میں سے تمہیں نکال لیا جائے گا۔''

آیات ۲۶ تا ۳۱

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ۭ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى
ذٰلِكَ خَيْرٌ ۭ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ۝ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ
الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا
سَوْاٰتِهِمَا ۭ اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ۭ اِنَّا جَعَلْنَا
الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَاۗءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا
عَلَيْهَآ اٰبَاۗءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ۭ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَاۗءِ ۭ اَتَقُوْلُوْنَ
عَلَي اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ ۡ وَاَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ
كُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۭ كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ ۝ فَرِيْقًا
هَدٰى وَفَرِيْقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلٰلَةُ ۭ اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَاۗءَ مِنْ
دُوْنِ اللّٰهِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ
مَسْجِدٍ وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ۝

آیت ۲۶ ﴿يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ۭ﴾ ''اے آدمؑ کی اولاد' ہم نے تم پر لباس اتارا جو تمہاری شرمگاہوں کو ڈھانپتا ہے اور آرائش و زیبائش کا سبب بھی ہے۔''

عربوں کے ہاں زمانۂ جاہلیت کے غلط رسم و رواج اور نظریات میں سے ایک رہبانہ نظریہ یا تصور یہ بھی تھا کہ لباس انسانی جسم کے لیے خواہ مخواہ کا تکلّف ہے اور یہ شرم کا احساس جو

انسان نے اپنے اوپر اوڑھ رکھا ہے یہ بھی انسان کا خود اپنا پیدا کردہ ہے۔ اس نظریے کے تحت ان کے مرد اور عورتیں مادر زاد ننگے ہو کر کعبۃ اللہ کا طواف کرتے تھے۔ ان کے نزدیک یہ نفیٔ ذات (self annihiliation) کا بہت بڑا مظاہرہ تھا اور یوں اللہ تعالیٰ کے قرب کا ایک خاص ذریعہ بھی۔ اس طرح کے خیالات و نظریات بعض معاشروں میں آج بھی پائے جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی بعض ملنگ قسم کے لوگ لباس پر عریانی کو ترجیح دیتے ہیں' جبکہ عوام الناس عام طور پر ایسے لوگوں کو اللہ کے مقرّب بندے سمجھتے ہیں۔ اس آیت میں دراصل ایسے جاہلانہ نظریات کی نفی کی جا رہی ہے کہ تمہارے لیے لباس کا تصوّر اللہ کا ودیعت کردہ ہے۔ یہ نہ صرف تمہاری ستر پوشی کرتا ہے بلکہ تمہارے لیے زیب و زینت کا باعث بھی ہے۔

﴿وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ ۭ﴾ ''اور (اس سے بڑھ کر) تقویٰ کا لباس جو ہے وہ سب سے بہتر ہے۔''

سب سے بہتر لباس تقویٰ کا لباس ہے' اگر یہ نہ ہو تو بسا اوقات انسان لباس پہن کر بھی ننگا ہوتا ہے' جیسا کہ انتہائی تنگ لباس' جس میں جسم کے نشیب و فراز ظاہر ہو رہے ہوں یا عورتوں کا اس قدر باریک لباس جس میں جسم جھلک رہا ہو۔ ایسا لباس پہننے والی عورتوں کے بارے میں حضور ﷺ نے ''كَاسِيَاتٌ عَارِيَاتٌ'' کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں' یعنی جو لباس پہن کر بھی ننگی رہتی ہیں۔ ان کے بارے میں فرمایا کہ یہ عورتیں جنت میں داخل ہونا تو درکنار' جنت کی ہوا بھی نہ پا سکیں گی' جبکہ جنت کی ہوا پانچ سو سال کی مسافت سے بھی محسوس ہو جاتی ہے۔(۱) چنانچہ لِبَاسُ التَّقْوٰى سے مراد ایک طرف تو یہ ہے کہ انسان جو لباس زیب تن کرے وہ حقیقی معنوں میں تقویٰ کا مظہر ہو اور دوسری طرف یہ بھی کہ انسانی شخصیت کی اصل زینت وہ لباس ہے جس کا تانا بانا شرم و حیا اور خدا خوفی سے بنتا ہے۔

﴿ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ۝۲۶﴾ ''یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے تاکہ یہ لوگ نصیحت اخذ کریں۔''

آیت ۲۷ ﴿يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا ۭ﴾ ''اے بنی آدم (دیکھو اب) شیطان تمہیں فتنہ

(۱) صحیح مسلم' کتاب اللباس والزینۃ' باب النساء الکاسیات العاریات المائلات الممیلات۔
وموطأ مالك' کتاب الجامع' باب ما یکرہ للنساء لبسہ من الثیاب۔ راوی: ابوہریرۃؓ۔

میں نہ ڈالنے پائے‘ جیسے کہ تمہارے والدین کو اُس نے جنت سے نکلوا دیا تھا (اور) اُس نے اُتروا دیا تھا ان سے ان کا لباس‘ تاکہ ان پر عیاں کر دے ان کی شرمگاہیں۔‘‘

﴿اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ؕ﴾ ’’یقیناً وہ اور اس کی ذُریت وہاں سے تم پر نظر رکھتے ہیں جہاں سے تم انہیں دیکھ نہیں سکتے۔‘‘

چونکہ ابلیس کو اللہ کی طرف سے قیامت تک چھوٹ ملی ہوئی ہے لہٰذا وہ نہ صرف مسلسل زندہ ہے‘ بلکہ اس نے اپنی اولاد اور اپنے نمائندوں کو اپنے ایجنڈے کی تکمیل کے لیے انسانوں کے درمیان پھیلا رکھا ہے۔ یہ جن شیاطین چونکہ غیر مرئی (invisible) مخلوق ہیں اس لیے وہ ایسی ایسی جگہوں پر ہماری گھات میں بیٹھے ہوتے ہیں اور ایسے ایسے طور طریقوں سے حملہ آور ہوتے ہیں جس کا ہلکا سا اندازہ بھی ہم نہیں کر سکتے۔

﴿اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۲۷﴾﴾ ’’ہم نے تو شیاطین کو ان لوگوں کا دوست بنا دیا ہے جو ایمان نہیں لاتے۔‘‘

جیسے گندگی اور مکھی کا فطری ساتھ ہے ایسے ہی شیطان اور منکرینِ حق کا یارانہ ہے۔ جس دل میں ایمان نہیں ہوگا اور وہ اللہ کے ذکر کے نور سے محروم ہوگا‘ وہ ’’خانۂ خالی را دیو می گیرد‘‘ کے مصداق شیطان ہی کا اڈہ بنے گا۔

آیت ۲۸ ﴿وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَآءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ؕ﴾ ’’اور جب یہ لوگ کوئی بے حیائی کا کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے پایا ہے یہی کچھ کرتے ہوئے اپنے آباء و اَجداد کو‘ اور اللہ نے ہمیں اس کا حکم دیا ہے۔‘‘

یہ لوگ جب ننگے ہو کر خانہ کعبہ کا طواف کرتے تو اس شرمناک فعل کا جواز پیش کرتے ہوئے کہتے کہ ہم نے اپنے آباء و اَجداد کو ایسے ہی کرتے دیکھا ہے اور یقیناً اللہ ہی نے اس کا حکم دیا ہوگا۔ یہ گویا ان کے نزدیک ایک ٹھوس‘ قرائنی شہادت (circumstantial evidence) تھی کہ جب ایک رِیت اور رسم چلی آ رہی ہے تو یقیناً یہ سب کچھ اللہ کی مرضی اور اس کے حکم کے مطابق ہی ہو رہا ہوگا۔

﴿قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸﴾﴾ ’’(اے نبی ﷺ! ان سے) کہہ دیجیے کہ اللہ تعالیٰ بے حیائی کا حکم نہیں دیتا‘ تو کیا تم اللہ

کی طرف منسوب کر رہے ہو وہ کچھ جس کا تمہیں کوئی علم نہیں۔‘‘

آیت ۲۹ ﴿قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ ۫ وَاَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ﴾ ’’آپؐ کہیے کہ میرے ربّ نے تو حکم دیا ہے انصاف (اور عدل و توازن) کا‘ اور اپنے رُخ سیدھے کر لیا کرو ہر نماز کے وقت‘‘

مسجد اسمِ ظرف ہے اور یہ ظرفِ زمان بھی ہے اور ظرفِ مکان بھی۔ بطور ظرفِ مکان سجدے کی جگہ مسجد ہے اور بطور ظرفِ زمان سجدے کا وقت مسجد ہے۔

﴿وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ؕ﴾ ’’اور اُسی کو پکارا کرو اُسی کے لیے اپنی اطاعت کو خالص کرتے ہوئے۔‘‘

یعنی اللہ کو پکارنے‘ اس سے دعا کرنے کی ایک شرط ہے اور وہ یہ کہ اس کی اطاعت کو اپنے اوپر لازم کیا جائے۔ جیسا کہ سورۃ البقرۃ آیت ۱۸۶ میں روزے کے احکام اور حکمتوں کو بیان کرنے کے بعد فرمایا: ﴿اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ﴾ کہ میں تو ہر پکارنے والے کی پکار سنتا ہوں‘ اُس کی دعا کو قبول کرتا ہوں‘ لیکن انہیں بھی تو چاہیے کہ میرا کہنا مانیں —— اور یہ کہنا ماننا یا اطاعت جزوی طور پر قابلِ قبول نہیں‘ بلکہ اس کے لیے ﴿اُدْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ۪﴾ (البقرۃ: ۲۰۸) کا معیار سامنے رکھنا ہوگا‘ یعنی اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں پورے پورے داخل ہونا ہوگا۔ لہٰذا اس حوالے سے یہاں فرمایا گیا کہ اپنی اطاعت کو اُسی کے لیے خالص کرتے ہوئے اسے پکارو۔ یعنی اس کی اطاعت کے دائرے کے اندر کُلی طور پر داخل ہوتے ہوئے اس سے دعا کرو۔ یہاں یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ انسان کو اپنی زندگی میں بے شمار اطاعتوں سے سابقہ پڑتا ہے‘ والدین کی اطاعت‘ اساتذہ کی اطاعت‘ الوالامر کی اطاعت وغیرہ۔ تو اس میں بنیادی طور پر جو اصول کارفرما ہے وہ یہ ہے کہ ’’لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِيْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ‘‘۔ یعنی مخلوق میں سے کسی کی ایسی اطاعت نہیں کی جائے گی جس میں خالق حقیقی کی معصیت لازم آتی ہو۔ اللہ کی اطاعت سب سے اوپر اور سب سے برتر ہے۔ اس کی اطاعت کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے باقی سب اطاعتیں ہو سکتی ہیں‘ مگر جہاں کسی کی اطاعت میں اللہ کے کسی حکم کی خلاف ورزی ہوتی ہو تو ایسی اطاعت نا قابل قبول اور حرام ہوگی۔

﴿كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ ﴿۲۹﴾﴾ ''جیسے اُس نے تمہیں پہلے پیدا کیا تھا اسی طرح تم دوبارہ بھی پیدا ہو جاؤ گے۔''

آیت ۳۰ ﴿فَرِيْقًا هَدٰى وَفَرِيْقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلٰلَةُ﴾ ''ایک گروہ کو اُس نے ہدایت دے دی ہے اور ایک گروہ وہ ہے جس کے اوپر گمراہی مسلّط ہو چکی ہے۔''

یعنی جنہوں نے انکار کیا اور پھر اس انکار پر ڈٹ گئے وہ اپنی اس متعصّبانہ روش کی وجہ سے‘ اپنی ضد اور اپنی ہٹ دھرمی کے سبب‘ اپنے حسد اور تکبر کے باعث گمراہی کے مستحق ہو چکے ہیں۔

﴿اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۳۰﴾﴾ ''(اور یہ اس لیے کہ) انہوں نے شیطانوں کو اپنا ساتھی بنا لیا اللہ کو چھوڑ کر اور سمجھتے یہ ہیں کہ ہم ہدایت پر ہیں۔''

آیت ۳۱ ﴿يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ﴾ ''اے آدمؑ کی اولاد! اپنی زینت استوار کیا کرو ہر نماز کے وقت''

یہاں اچھے لباس کو زینت کہا گیا ہے‘ جیسا کہ آیت ۲۶ میں لباس کو رِیْشًا فرمایا گیا تھا‘ یعنی لباس انسان کے لیے زیب و زینت کا ذریعہ ہے۔ یہاں ایک نکتہ یہ بھی قابل غور ہے کہ ابھی جن تین آیات (۲۶‘ ۲۷ اور ۳۱) میں لباس کا ذکر ہوا ہے‘ ان تینوں میں بنی آدم کو مخاطب کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ لباس کا معاملہ پوری نوع انسانی سے متعلق ہے۔ بہر حال اس آیت میں جو اہم حکم دیا جا رہا ہے وہ نماز کے وقت بہتر لباس زیب تن کرنے کے بارے میں ہے۔ ہمارے ہاں اس سلسلے میں عام طور پر اُلٹی روش چلتی ہے۔ دفتر اور عام میل ملاقات کے لیے تو عموماً بہت اچھے لباس کا اہتمام کیا جاتا ہے‘ لیکن مسجد جانا ہو تو میلے کچیلے کپڑوں سے ہی کام چلا لیا جاتا ہے۔ لیکن یہاں اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ جب تمہیں میرے دربار میں آنا ہو تو پورے اہتمام کے ساتھ آیا کرو‘ اچھا اور صاف ستھرا لباس پہن کر آیا کرو۔

﴿وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۳۱﴾﴾ ''اور کھاؤ اور پیو البتہ اسراف نہ کرو‘ یقیناً وہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''

بنی آدم سے کہا جا رہا ہے کہ یہ دنیا کی چیزیں تمہارے لیے ہی بنائی گئی ہیں اور ان چیزوں سے جائز اور معروف طریقوں سے استفادہ کرنے پر کوئی پابندی نہیں ہے‘ لیکن اللہ کی

عطا کردہ ان نعمتوں کے بے جا استعمال اور اسراف سے اجتناب بھی ضروری ہے‘ کیونکہ اسراف اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں۔ یہاں ایک طرف تو اسی رہبانی نظریہ کی نفی ہو رہی ہے جس میں اچھے کھانے‘ اچھے لباس اور زیب و زیبائش کو سرے سے اچھا نہیں سمجھا جاتا اور مفلسانہ وضع قطع اور ترکِ لذّات کو روحانی ارتقاء کے لیے ضروری خیال کیا جاتا ہے‘ جبکہ دوسری طرف دُنیوی نعمتوں کے بے جا اسراف اور ضیاع سے سختی سے منع کر دیا گیا ہے۔

اس سلسلے میں افراط و تفریط سے بچنے کے لیے ضروریاتِ زندگی کے اکتساب و تصرّف کے معیار اور فلسفے کو اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ایک مسلمان جہاں کہیں بھی رہتا بستا ہے اس کو دو صورتوں میں سے ایک صورت حال درپیش ہو سکتی ہے۔ اس کے ملک میں یا تو دین غالب ہے یا مغلوب۔ اب اگر آپ کے ملک میں اللہ کا دین مغلوب ہے تو آپ کا پہلا فرض یہ ہے کہ آپ اللہ کے دین کے غلبے کی جدّوجہد کریں اور اس کے لیے کسی باقاعدہ تنظیم میں شامل ہو کر اپنا بیشتر وقت اور صلاحیتیں اس جدّوجہد میں لگائیں۔ ایسی صورت حال میں دُنیوی طور پر ترقی کرنا اور پھلنا پھولنا آپ کی ترجیحات میں شامل ہی نہیں ہونا چاہیے‘ بلکہ آپ کی پہلی ترجیح دین کے غلبے کے لیے جدوجہد ہونی چاہیے اور آپ کا ماٹو ﴿اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶۲﴾﴾ (الانعام) ہونا چاہیے۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ مادی لحاظ سے بہت بہتر معیارِ زندگی کو برقرار نہیں رکھ سکیں گے۔ یہ اس لیے نہیں ہوگا کہ آپ رہبانیت یا ترکِ لذات کے قائل ہیں بلکہ اس کی وجہ یہ ہوگی کہ دُنیا اور دُنیوی آسائشیں کمانے کے لیے نہ آپ کوشاں ہیں اور نہ ہی اس کے لیے آپ کے پاس وقت ہے۔ آپ تو شعوری طور پر ضروریاتِ زندگی کو کم سے کم معیار پر رکھ کر اپنی تمام تر صلاحیتیں‘ اپنا وقت اور اپنے وسائل دین کی سربلندی کے لیے کھپا رہے ہیں۔ یہ رہبانیت نہیں ہے بلکہ ایک مثبت جہادی نظریہ ہے۔ جیسے نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام ؓ نے سختیاں جھیلیں اور اپنے گھربار اسی دین کی سربلندی کے لیے چھوڑے۔ کیونکہ اس کام کے لیے اللہ تعالیٰ آسمان سے فرشتوں کو نازل نہیں کرے گا‘ بلکہ یہ کام انسانوں نے کرنا ہے‘ مسلمانوں نے کرنا ہے۔ انسانی تاریخ گواہ ہے کہ جو لوگ انقلاب کے داعی بنے ہیں انہیں قربانیاں دینا پڑی ہیں‘ انہیں سختیاں اٹھانا پڑی ہیں۔ کیونکہ کوئی بھی انقلاب قربانیوں کے بغیر نہیں آتا۔ لہٰذا اگر آپ واقعی اپنے دین کو غالب کرنے کے لیے انقلاب کے داعی بن کر نکلے ہیں تو آپ کا معیارِ زندگی خود بخود کم سے کم ہوتا چلا جائے گا۔

(باقی صفحہ 66 پر)

''شہرِ عظیم'' اور ''رفیقِ تنظیم''

اویس پاشا قرنی☆

تنظیم اسلامی تمام دینی تحریکات میں اس اعتبار سے ممیّز ہے کہ اس کی اٹھان ''تحریک رجوع الی القرآن'' اور پھر ''انجمن خدام القرآن'' کے ذریعے ہوئی۔ اس کے بانی اور مؤسّس محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کا آج بھی بنیادی تعارف عوام الناس میں ''مدرّسِ قرآن'' ہی کا ہے اور بفضلہٖ تعالیٰ تنظیم اسلامی کے پلیٹ فارم سے قرآن کے انقلابی پیغام کو مؤثر انداز میں عام کیا جا رہا ہے۔ اس اعتبار سے رفقاء تنظیم کے لیے رمضان المبارک کی اہمیت دو چند ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ رمضان وہ مہینہ ہے جس کا بنیادی تعارف ہی باری تعالیٰ نے قرآن حکیم کے حوالہ سے کروایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ﴾ (البقرۃ:۱۸۵)

''رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا' لوگوں کے لیے ہدایت بنا کر اور ہدایت کی واضح نشانیوں اور حق و باطل کے درمیان امتیاز کے کھلے دلائل کے ساتھ۔''

احادیثِ رسول ﷺ میں بھی رمضان اور قرآن کے باہمی تعلق کو بیان کیا گیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

((وَكَانَ جِبْرِيْلُ يَلْقَاهُ فِيْ كُلِّ لَيْلَةٍ مِّنْ رَمَضَانَ فَيُدَارِسُهُ الْقُرْآنَ)) (۱)

''اور جبریلؑ رمضان کی ہر شب آپ ﷺ سے ملاقات کرتے تھے اور آپ ﷺ اُن سے قرآن کریم کا دور فرمایا کرتے تھے۔''

معلوم ہوا کہ رمضان جسے ایک حدیث مبارکہ (عن سلمان الفارسی رضی اللہ عنہ) میں ''شھرٌ عظیمٌ'' کہا گیا' قرآن حکیم سے خصوصی تعلق رکھتا ہے۔ اس بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ افراد جو

(۱) ناظم' شعبۂ تربیت تنظیم اسلامی حلقہ کراچی شمالی

(۱) صحیح البخاری' کتاب بدء الوحی و کتاب بدء الخلق' باب ذکر الملائکۃ۔

معاشرے میں قرآن کی دعوت لے کر اُٹھے ہوں انہیں اِس ماہ سے خصوصی نسبت حاصل ہو جاتی ہے ——— اور کیوں نہ ہو کہ رمضان المبارک تو ہے ہی جشنِ نزولِ قرآن کا مہینہ!

اس نسبت سے رفقائے تنظیم اسلامی کے لیے خصوصاً اور عوام الناس کے لیے عموماً چند گزارشات پیش کی جا رہی ہیں۔

رمضان المبارک سے قبل اس کی تیاری

رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور صلحائے اُمت کا یہ معمول ملتا ہے کہ رمضان سے قبل ہی اس کی تیاری فرمایا کرتے تھے۔ اس کی آمد پر خوش ہوتے اور جب چاند نظر آتا تو یہ دعا کرتے۔ (ویسے یہ دعا ہر ماہ کا چاند دیکھ کر پڑھنا بھی مسنون ہے۔)

((اَللّٰهُمَّ أَهِلَّهُ عَلَيْنَا بِالْاَمْنِ وَالْاِيْمَانِ وَالسَّلَامَةِ وَا لْاِ سْلَامِ' رَبِّيْ وَرَبُّكَ اللّٰهُ)) (۱)

''اے اللہ! طلوع فرما ہم پر یہ چاند امن و ایمان' سلامتی اور اسلام کے ساتھ' (اے چاند) میرا اور تیرا پروردگار اللہ ہے۔''

ہمیں بھی چاہیے کہ رمضان کی آمد سے قبل ہی اس کی تیاری کریں۔

۱۔ ذہنی تیاری:

کسی بھی اہم موقع سے قبل انسان اپنے آپ کو اُس کے لیے تیار کرتا ہے۔ اسی طرح رمضان میں زیادہ سے زیادہ عمل صالح کے لیے ہمیں چاہیے کہ اپنے آپ کو ذہناً تیار کریں۔ اس کام کے لیے بہترین ذریعہ وہ احادیث ہیں جو فضائلِ رمضان کے عنوان سے مختلف مجموعہ ہائے احادیث میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ مثلاً ''ریاض الصالحین'' از امام نوویؒ اور ''معارف الحدیث (جلد سوئم)'' از مولانا منظور نعمانیؒ میں متعلقہ ابواب کا مطالعہ مفید رہے گا۔ علاوہ ازیں ''خطبات''، ''اسلامی عبادات پر ایک تحقیقی نظر'' از مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی رحمہ اللہ اور ''عظمتِ صوم''، ''عظمتِ صیام و قیامِ رمضان'' از بانی محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کا مطالعہ روزہ جیسی عظیم عبادت کی حکمتوں کو ہم پر واضح کرنے میں مفید ثابت ہوگا۔

(۱) عن طلحة بن عبيد الله۔ سنن الترمذی' كتاب الدعوات والمستدرك على الصحيحين للحاكم' كتاب الادب' واللفظ له۔

۲۔ مسائل کا علم:

ہر کام سے قبل اُس کی بابت علم کا حصول بھی ضروری ہے۔ اسی طرح عبادات کے حوالے سے بھی ناگزیر اُمور کا علم حاصل کرنا ضروری ہے تاکہ اُنہیں صحت کے ساتھ ادا کیا جاسکے۔ رمضان سے قبل اور دوران، روزے کے مسائل کا بھی علم حاصل کرنا چاہیے تاکہ مفسدات ومکروہات سے بچا جاسکے اور آداب وشرائط کے ساتھ یہ فریضہ ادا ہو۔ اسی طرح جن افراد کا اعتکاف کا ارادہ ہو اُنہیں اس کے مسائل سے بھی واقفیت حاصل کرنی چاہیے۔ اس کام کے لیے ''آسان فقہ'' از مولانا یوسف اصلاحیؒ اور ''تعلیم الاسلام'' از مفتی کفایت اللہ دہلویؒ، بلوغ المرام وغیرہ میں متعلقہ ابواب کا مطالعہ مفید رہے گا۔

۳۔ معمولات کا تعیّن:

ذہنی تیاری میں یہ بات بھی اہم ہے کہ رفقاء قبل از رمضان ہی اس مہینہ کے معمولات کا تعین کریں اور زیادہ سے زیادہ وقت عبادات ودینی مشاغل کے لیے فارغ کرنے کی کوشش کی جائے۔ لایعنی اُمور سے مکمل اجتناب کا عزم ہو۔ اپنے لیے خود سہل الحصول اَہداف معیّن کرنے چاہئیں، جیسے روزانہ تلاوتِ قرآن حکیم کے نصاب میں گراں قدر اضافہ، کسی تفسیر یا دینی کتب کا مطالعہ وغیرہ۔ یہ بات دیکھنے میں آئی ہے کہ بعض لوگ رمضان کی بابرکت ساعتوں کو عید کی شاپنگ، گھر کی مرمت یا رنگ وروغن وغیرہ جیسے غیر اہم کاموں میں ضائع کر دیتے ہیں۔ اہتمام کرنا چاہیے کہ ناگزیر امور قبل از رمضان نمٹا لیے جائیں۔

۴۔ دورۂ ترجمۂ قرآن کی تیاری:

رفقائے تنظیم کے لیے رمضان المبارک میں دورۂ ترجمہ قرآن کی صورت میں حصولِ اجر وثواب اور ادائیگیٔ فرض کا بھرپور موقع فراہم ہوتا ہے۔ اس کی بہت سی انتظامی تیاریاں قبل از رمضان ہی کی جاتی ہیں۔ اس میں بھرپور شرکت ہم میں سے ہر رفیق کی ذمہ داری ہے۔ اس کے لیے وقت اور مال کا انفاق رمضان سے قبل ہی شروع ہو جانا چاہیے۔ احباب کو دورۂ ترجمۂ قرآن میں شرکت کے لیے پیشگی آمادہ کرنا دعوتی کام کا لازمی حصّہ ہے۔ اس حوالہ سے اپنے نقیب اور دیگر ذمہ داران سے مستقل رابطہ میں رہتے ہوئے بروقت امور کی انجام دہی ان شاء اللہ ہمارے لیے اُخروی اثاثہ ثابت ہوگی۔ کیا عجب کہ ہماری دعوت پر آنے والے کسی شخص کی زندگی قرآن کی دعوت کو سن کر تبدیل ہو جائے، ہمارے لیے صدقۂ جاریہ کا باعث بنے اور ہم سرخ اونٹوں کی بشارت کے مستحق ٹھہریں۔ **وما ذٰلك على اللّٰهِ بعزيز!**

رمضان المبارک کے دوران انفرادی امور

۱۔ روزہ (صیام):

اللہ تبارک وتعالیٰ نے روزہ کی عبادت کو فرض ٹھہرایا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾ (البقرۃ:۱۸۵)

''سو جو کوئی تم میں سے اس مہینے کو پائے اس کے روزے رکھے۔''

﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ (البقرۃ:۱۸۳)

''تم پر روزہ فرض کیا گیا ہے جیسا کہ تم سے پہلے والوں پر فرض کیا گیا تھا۔''

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی روایت کیا ہے:

((مَنْ صَامَ رَمَضَانَ اِيْمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ)) (۱)

''جس نے رمضان کے روزے ایمان اور ثواب کی امید کے ساتھ رکھے اُس کے پچھلے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔''

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((كُلُّ عَمَلِ ابْنِ آدَمَ يُضَاعَفُ الْحَسَنَةُ عَشْرُ اَمْثَالِهَا اِلٰى سَبْعِمِائَةِ ضِعْفٍ، قَالَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ اِلَّا الصَّوْمَ فَاِنَّهٗ لِيْ وَاَنَا اَجْزِيْ بِهٖ، يَدَعُ شَهْوَتَهٗ وَطَعَامَهٗ وَشَرَابَهٗ مِنْ أَجْلِيْ، لِلصَّائِمِ فَرْحَتَانِ فَرْحَةٌ عِنْدَ فِطْرِهٖ وَفَرْحَةٌ عِنْدَلِقَاءِ رَبِّهٖ، وَلَخُلُوْفُ فَمِ الصَّائِمِ أَطْيَبُ عِنْدَا للّٰهِ مِنْ رِيْحِ الْمِسْكِ))(۲)

''انسان جو بھی عمل کرتا ہے اُس کا اجر اسے دس گنا سے لے کر سات سو گنا تک ملتا ہے، لیکن روزے کی بابت اللہ عزوجل فرماتے ہیں کہ یہ عمل چونکہ خالص میرے لیے ہے اس لیے میں خود ہی اس کی جزا دوں گا۔ کیونکہ روزہ دار صرف میری خاطر اپنی جنسی خواہش اور کھانا پینا چھوڑتا ہے۔ روزہ دار کے لیے دو خوشیاں ہیں، ایک خوشی اسے روزہ کھولتے وقت حاصل ہوتی ہے اور دوسری اس وقت حاصل ہوگی جب وہ اپنے رب سے ملاقات کرے گا۔ اور روزہ دار کے منہ کی بو اللہ کے نزدیک کستوری کی خوشبو سے

(۱) صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب صوم رمضان احتساباً من الایمان۔

(۲) صحیح مسلم، کتاب الصیام، باب فضل الصیام۔ و سنن ابن ماجہ، کتاب الصیام، باب ماجاء فی فضل الصیام۔

زیادہ پاکیزہ ہے۔''

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر روزے کی عبادت کو ایسی کیا امتیازی شان حاصل ہے کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ بذاتِ خود اس کا اجر عطا فرمائیں گے!

ایک اور حدیث میں روزہ دار کی خصوصی فضیلت کا تذکرہ بایں الفاظ فرمایا گیا:

((اِنَّ فِی الْجَنَّةِ بَابًا یُقَالُ لَهُ الرَّیَّانُ یَدْخُلُ مِنْهُ الصَّائِمُوْنَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ' لَا یَدْخُلُ مِنْهُ اَحَدٌ غَیْرَ هُمْ' یُقَالُ: اَیْنَ الصَّائِمُوْنَ ؟ فَیَقُوْمُوْنَ' لَایَدْخُلُ مِنْهُ اَحَدٌ غَیْرُهُمْ' فَاِذَا دَخَلُوْا اُغْلِقَ فَلَمْ یَدْ خُلْ مِنْهُ اَحَدٌ)) (۱)

''یقیناً جنت میں ایک دروازہ ہے جسے ''ریّان'' (تروتازگی) کہا جاتا ہے' اُس دروازہ سے قیامت کے روز روزے دار داخل ہوں گے' ان کے علاوہ کوئی اُس سے داخل نہیں ہوگا۔ کہا جائے گا کہاں ہیں روزے دار؟ تو وہ کھڑے ہو جائیں گے۔ اس دروازے سے ان کے علاوہ کوئی اور داخل نہ ہوگا۔ پس جب وہ داخل ہو جائیں گے تو دروازہ بند کر دیا جائے گا اور کوئی اس میں داخل نہ ہو سکے گا۔''

مندرجہ بالا دونوں احادیث میں روزہ کی عبادت کو تمام عبادات میں جو ایک خصوصی مقام دیا گیا ہے اس کی توجیہہ محترم بانیٔ تنظیم اسلامی رحمہ اللہ نے یہ فرمائی ہے کہ دیگر اعمالِ صالحہ کی جزا تو روزِ قیامت جنت کے انعام واکرام کی صورت میں دی جائے گی جب کہ حکمت دین کی رو سے معلوم ہوتا ہے کہ روزہ چونکہ روح کی بالیدگی اور تروتازگی کا سبب ہے اور روح کو ایک خاص نسبت ذاتِ باری تعالیٰ سے ہے' از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ﴾ (الحجر:۲۹) چنانچہ روزہ کی عظیم الشان عبادت سے روحِ انسانی کا ذات باری تعالیٰ کی طرف رفع اور علو ہوتا ہے' یعنی براہ راست اللہ تعالیٰ سے تعلق قائم ہوتا ہے۔ معلوم ہوا کہ دن کا روزہ اور رات کا قیام تعلق مع اللہ کے حصول کا بہترین ذریعہ ہے۔

اسی طرح اس حدیث کی وہ روایت کہ جس میں ''اَنَا اُجْزٰی بِهٖ'' (میں ہی روزہ کی جزا ہوں) وارد ہوا ہے' بھی سمجھ میں آجاتی ہے' اور دوسری حدیث میں جو روزہ داروں کے لیے مخصوص دروازے کو ''باب الریان'' (تروتازگی والا دروازہ کہا گیا) اس کی بھی ایک تاویل سمجھ میں آتی ہے کہ روح کی تازگی مراد ہے' جسم تو روزے سے ضعف ہی کا شکار ہوتا ہے۔ واللہ اعلم!

(۱) صحیح البخاری' کتاب الصوم' باب الریان للصائمین۔ عن سهل بن سعد رضی اللہ عنہ

وہ اُمور جن سے اجتناب ضروری ہے

اس سے قبل روزہ کی فرضیت اور فضیلت پیش کی گئی۔ اس فضیلت کے حامل وہی روزے دار ہوں گے جو اس عبادت کو تمام شرائط وآداب کے ساتھ بجا لائیں۔ اعمال کی قبولیت کے حوالے سے قرآن نے اپنا نقطۂ نظر خوب واضح کر دیا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿اِنَّمَا یَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِیْنَ۝۲۷﴾ (المائدۃ)

''بیشک اللہ متقیوں ہی سے قبول فرماتا ہے۔''

متقی ہونے یعنی تقویٰ کا تقاضا ہے کہ ہم اُن امور سے اجتناب کریں جو روزے کی روح کے منافی ہیں۔ چنانچہ حدیث کی روایات میں ہمیں آنجناب ﷺ کے ایسے ارشادات ملتے ہیں جن میں اُن امور کی نشاندہی فرمائی گئی ہے جن سے ایک روزہ دار کو اجتناب کرنا چاہیے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اِذَا کَانَ یَوْمُ صَوْمِ اَحَدِکُمْ فَلَا یَرْفُثْ وَلَا یَصْخَبْ' فَاِنْ سَابَّهُ اَحَدٌ اَوْ قَاتَلَهُ فَلْیَقُلْ اِنِّیْ صَائِمٌ)) (۱)

''جب تم میں سے کسی کا روزہ ہو تو وہ نہ تو فحش گوئی کرے اور نہ ہی شور وغل مچائے۔ اگر کوئی دوسرا اسے گالی دے یا لڑنے کی کوشش کرے تو اُس سے کہہ دے کہ میں روزے سے ہوں۔''

اسی طرح ایک روایت میں روزہ کی اصل روح یعنی تقویٰ کو یوں واضح کیا گیا ہے:

((مَنْ لَّمْ یَدَعْ قَوْلَ الزُّوْرِ وَالْعَمَلَ بِهٖ فَلَیْسَ لِلّٰهِ حَاجَةٌ فِیْ اَنْ یَّدَعَ طَعَامَهٗ وَشَرَابَهٗ)) (۲)

''جس نے جھوٹ بولنا اور اُس پر عمل کرنا نہ چھوڑا تو اللہ کو کوئی حاجت نہیں کہ یہ شخص اپنا کھانا پینا چھوڑے۔''

وہ افراد جو دورانِ رمضان عمومی ماحول کے تحت روزہ تو رکھ رہے ہیں اور راتوں کو قیام بھی

(۱) صحیح البخاری' کتاب الصوم' باب هل یقول انی صائم اذاشتم۔ و صحیح مسلم' کتاب الصیام' باب فضل الصیام۔

(۲) صحیح البخاری' کتاب الصوم' باب من لم یدع قول الزور والعمل به فی الصوم۔ وسنن الترمذی' کتاب الصوم' باب ما جاء فی التشدید فی الغیبة للصائم۔ عن ابی هریرة رضی اللہ عنہ۔

کر رہے ہیں مگر ان عبادات کی حقیقت اُنہیں حاصل نہیں یا عمل میں اخلاص نہ ہونے کی وجہ سے وہ عنداللہ ثمر بار نہیں ہوتیں' اس طرزِ عمل کی مذمت کلام رسالت مآب ﷺ میں واضح کر دی گئی ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((كَمْ مِّنْ صَائِمٍ لَيْسَ لَهُ مِنْ صِيَامِهِ اِلَّا الْجُوْعُ' وَكَمْ مِنْ قَائِمٍ لَيْسَ لَهُ مِنْ قِيَامِهِ اِلَّا السَّهَرُ))(۱)

''کتنے ہی روزہ دار ایسے ہیں کہ روزے سے بھوک پیاس کے سوا اُن کے پلے کچھ نہیں پڑتا اور کتنے ہی راتوں کو کھڑے رہنے والے ہیں کہ جنہیں اس قیام سے رت جگے کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔''

۲۔ قیام:

رمضان المبارک کی راتوں میں نفل نماز کا ادا کرنا حد درجہ باعث فضیلت ہے۔ ویسے بھی فرض نمازوں کے بعد اللہ کے ہاں رات کی نماز کو خاص مقام حاصل ہے۔ عباد الرحمٰن کے اوصاف میں اس وصف کا خصوصیت کے ساتھ تذکرہ کیا گیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا ﴾(الفرقان)

''اور وہ لوگ جو کہ اپنی راتیں گزارتے ہیں اپنے رب کے حضور سجدے کی حالت میں اور قیام کی حالت میں۔''

اور آنجناب ﷺ نے بشارت دی:

((اَيُّهَا النَّاسُ اَفْشُوا السَّلَامَ وَ اَطْعِمُوا الطَّعَامَ وَصَلُّوْا بِاللَّيْلِ وَالنَّاسُ نِيَامٌ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِسَلَامٍ))(۲)

''اے لوگو! سلام کو عام کرو اور کھانا کھلاؤ اور نماز پڑھو رات میں جبکہ لوگ سو رہے ہوں' تم داخل ہو جاؤ گے جنت میں سلامتی کے ساتھ۔''

یہ تو رات کی نماز کی عمومی فضیلت تھی' جبکہ وہ افراد جو دعوتِ دین اور اقامتِ دین جیسے فرائض کی

(۱) سنن ابن ماجه' كتاب الصيام' باب ماجاء فى الغيبة والرفث للصائم۔ و مسند احمد' باقى مسند المكثرين' مسند ابى هريره۔ وسنن الدارمى' كتاب الرقاق' باب فى المحافظة على الصوم۔

(۲) سنن الترمذى' كتاب صفة القيامة والرقائق والورع۔ و سنن ابن ماجه' كتاب اقامة الصلاة والسنة فيها' باب ماجاء فى قيام اليل۔ عن عبد الله بن سلام رضی اللہ عنہ

ادائیگی کے لیے کمر بستہ ہوں اُن کے لیے تو یہ فضیلت سے بڑھ کر ضرورت کا درجہ رکھتی ہے۔ چنانچہ نبی مکرم ﷺ کو جب رسالت کی عظیم ذمہ داری سونپی گئی تو اس سے قبل اس کی تیاری کے لیے قیام اللیل ہی کا حکم دیا گیا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۙ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۙ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۙ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۙ اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا ۙ اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِيْلًا ۙ اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا ۙ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا ﴾ (المزمل)

''اے اوڑھ لپیٹ کر سونے والے' رات کو نماز میں کھڑے رہا کرو مگر کم' آدھی رات' یا اس سے کچھ کم کر لو' یا اس سے کچھ زیادہ بڑھا دو' اور قرآن کو خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھو۔ ہم تم پر ایک بھاری کلام نازل کرنے والے ہیں۔ درحقیقت رات کا اٹھنا نفس پر قابو پانے کے لیے بہت کارگر اور قرآن ٹھیک پڑھنے کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ دن کے اوقات میں تو تمہارے لیے بہت مصروفیات ہیں۔ اپنے رب کے نام کا ذکر کیا کرو اور سب سے کٹ کر اُسی کے ہو رہو۔''

مزید برآں رات کی نماز کو رمضان المبارک اور روزے کے ساتھ خاص نسبت ہے جس کی بنا پر اس ماہ کے دوران آپ ﷺ قیام اللّیل کا خصوصیت کے ساتھ اہتمام فرماتے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی تشویق کراتے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يُرَغِّبُ فِيْ قِيَامِ رَمَضَانَ مِنْ غَيْرِ اَنْ يَّاْمُرَ هُمْ فِيْهِ بِعَزِيْمَةٍ فَيَقُوْلُ : ((مَنْ قَامَ رَمَضَانَ اِيْمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ)) (۱)

''رسول اللہ ﷺ قیامِ رمضان کی ترغیب دلاتے تھے بغیر اس کے کہ اسے لازم کریں۔ پس آپ ﷺ فرماتے: ''جس نے رمضان کی راتوں میں قیام کیا ایمان کی حالت میں اور ثواب کی نیت سے تو اُس کے پچھلے گناہ معاف کر دیے گئے۔''

معلوم ہوا کہ رمضان المبارک میں رات کے قیام کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ دراصل حکمت دین کی رو سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس ماہ کے دوران اللہ تبارک

(۱) صحيح مسلم' كتاب صلاة المسافرين و قصرها' باب الترغيب فى قيام رمضان وهو التراويح۔

وتعالیٰ اہل ایمان کو تربیت وتزکیۂ نفس کا ایک جامع پروگرام دیتے ہیں جس میں دن کا روزہ اور رات کا قیام دو متوازی عناصر ہیں۔ ان دونوں کے ملنے سے وہ مقاصد حاصل ہوتے ہیں جو ایک ماہ کی ریاضت وعبادت کا حاصل ہے' یعنی تعلق مع اللہ (از روئے حدیث: وَاَنَا اَجْزِیْ بِہٖ) اور تقویٰ (از روئے قرآن: لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ) چنانچہ رفقائے تنظیم کو چاہیے کہ جس کارِ عظیم یعنی اقامت دین کا بیڑا انہوں نے اٹھایا ہے' اس کی جدّوجُہد میں عزیمت کی راہ اختیار کرتے ہوئے قیام اللیل کا خصوصی اہتمام کریں' جس میں باجماعت نمازِ تراویح کی ادائیگی ناگزیر ہے' بلکہ اس سے بڑھ کر رات کے آخری پہر یعنی سحری سے قبل انفرادی طور پر بھی تہجد کا اہتمام کریں۔ وباللہ التوفیق۔

۳۔ فہم وتلاوتِ قرآن:

گزشتہ کلام کی روشنی میں رمضان اور قرآن کا ربط وتعلق ـــــ الحمدللہ ـــــ کافی واضح ہو چکا۔ چنانچہ رفقاء کو چاہیے کہ رمضان المبارک میں قرآن مجید کی تلاوت وترتیل کا خصوصی اہتمام کریں۔ ہر روز کا جو نصاب تلاوت معیّن ہے اُس میں اضافہ ضرور ہونا چاہیے۔ ساتھ ہی قرآن حکیم کے معنی ومفاہیم سے آگاہی کا بھی اہتمام ہو۔ اللہ ربّ العزت بانیٔ محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کو حسنات سے نوازے کہ اُن کی جاری کردہ دورۂ ترجمۂ قرآن کی روایت سے رمضان المبارک میں قرآن حکیم کی تفہیم وتلاوت سے بہرمند ہونے کا ایک حسین موقع ہم رفقاء کو خصوصیت کے ساتھ حاصل رہتا ہے۔ اب یہ ہم پر منحصر ہے کہ ہم اس موقع سے کتنا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ساتھ ہی ہمیں انفرادی طور پر بھی تلاوت کا اہتمام کرنا چاہیے۔ دورۂ ترجمۂ قرآن کے دوران جو وقت ہمارا قرآن کے ساتھ صرف ہوتا ہے اُسے نبی اکرم ﷺ کے معمولات سے کسی درجہ میں مشابہت حاصل ہو جاتی ہے' جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

((کَانَ جِبْرِیْلُ یَلْقَاہُ فِیْ کُلِّ لَیْلَۃٍ مِنْ رَمَضَانَ فَیُدَارِسُہُ الْقُرْآنَ))(۱)

''جبریل علیہ السلام رمضان کی ہر شب آپ ﷺ سے ملاقات کرتے تھے اور آپ ﷺ ان سے قرآن کریم کا دور فرماتے تھے۔''

۴۔ روزہ افطار کروانا:

احادیث میں اس کی فضیلت بیان ہوئی ہے' اور یہ فضیلت عام ہے' خواہ کسی محتاج کو روزہ

(۱) صحیح البخاری۔ (حوالہ گزر چکا ہے)

افطار کروایا جائے یا اَعزہ واَقارب یا رفقاء واحباب کو۔ حضرت زید بن خالد الجہنی رضی اللہ عنہ فرمانِ رسول ﷺ روایت کرتے ہیں:

((مَنْ فَطَّرَ صَائِمًا کَانَ لَہٗ مِثْلُ اَجْرِہٖ غَیْرَ اَنَّہٗ لَا یَنْقُصُ مِنْ اَجْرِ الصَّائِمِ شَیْئًا))(۱)

''جس نے کسی روزہ دار کو روزہ افطار کروایا اُس کے لیے بھی اتنا ہی اجر ہے بغیر اس کے کہ روزہ دار کے اجر میں کوئی کمی کی جائے۔''

۵۔ سحری کرنا:

بعض لوگ رات کو ہی کھا کر سو جاتے ہیں اور سحری کے وقت بیدار نہیں ہوتے۔ یہ مناسب نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے رات کے آخری پہر میں سحری کرنے کو پسند فرمایا ہے اور اسے باعث برکت قرار دیا ہے' چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

((تَسَحَّرُوْا فَاِنَّ فِی السَّحُوْرِ بَرَکَۃً))(۲)

''سحری کیا کرو کہ بے شک سحری میں برکت ہے۔''

۶۔ آخری عشرے کا اہتمام:

ویسے تو تمام رمضان المبارک کو دیگر ایام پر فضیلت حاصل ہے مگر اِس ماہ کے آخری عشرے کی خصوصی فضیلت اور اہتمام احادیث مبارکہ سے واضح ہوتا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں:

((کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ یَجْتَہِدُ فِی الْعَشْرِ الْاَوَاخِرِ مَالَا یَجْتَہِدُ فِیْ غَیْرِہٖ))(۳)

''رسول اللہ ﷺ (رمضان المبارک کے دوران) آخری عشرے میں عبادات کا جو اہتمام فرماتے وہ بقیہ رمضان سے زائد ہوتا۔''

اس اہتمام کی نوعیت دوسری روایت' جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے مروی ہے' میں واضح

(۱) سنن الترمذی' کتاب الصوم' باب ماجاء فی فضل من فطر صائماً۔

(۲) صحیح البخاری' کتاب الصوم' باب برکۃ السحورمن غیر ایجاب۔ و صحیح مسلم' کتاب الصیام' باب فضل السحور..... عن انس بن مالك رضی اللہ عنہ۔

(۳) صحیح مسلم' کتاب الاعتکاف' باب الاجتھاد فی العشرالاواخر من شھر رمضان۔

ہوتی ہے۔آپ ؓ فرماتی ہیں:

((اِذَا دَخَلَ الْعَشْرُ اَحْیَا اللَّیْلَ وَاَیْقَظَ اَھْلَہٗ وَجَدَّ وَشَدَّ الْمِئْزَرَ)) (۱)

''جب (رمضان المبارک) کا آخری عشرہ داخل ہوتا تو آپ ﷺ راتوں کو زندہ فرماتے (یعنی شب بیداری فرماتے)' اپنے گھر والوں کو بھی جگاتے اور خوب محنت کرتے اور کمر کس لیتے۔''

یہ بات محتاجِ بیان نہیں کہ غلبۂ دین کی جدّوجُہد کرنے والے افراد کے لیے مزاجِ رسول ﷺ سے قرب کس قدر مفید ہے۔ان روایات سے ہمارے سامنے عبادات کی بابت آپ ﷺ کا مزاجِ عالی واضح ہوتا ہے۔داعیٔ دین کی شخصیت کا اصل نور مزاجِ نبوی ﷺ کی مطابقت میں پوشیدہ ہے۔

۷۔اعتکاف:

اعتکاف کے معنی لغت میں جم کر بیٹھنے کے ہیں اور شرعاً اعتکاف ایک عبادت کا نام ہے جس کے کچھ شرائط اور آداب ہیں جو کتب فقہ میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ہم یہاں اس کی فضیلت پر مشتمل روایت نقل کر رہے ہیں تا کہ جو افراد اس کا اہتمام کر سکتے ہوں وہ اِس جانب متوجہ ہو جائیں۔

((اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ کَانَ یَعْتَکِفُ الْعَشْرَ الْاَوَاخِرَ مِنْ رَمَضَانَ حَتّٰی تَوَفَّاہُ اللّٰہُ تَعَالٰی)) (۲)

''نبی اکرم ﷺ رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف فرمایا کرتے تھے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو وفات سے دوچار کیا۔''

اس روایت سے معلوم ہوا کہ نبی اکرم ﷺ کا یہ معمول رہا کہ ہر سال اعتکاف فرمایا کرتے تھے۔اور یہ عمل آپ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کے آخری سال تک جاری رہا۔

۸۔لیلۃ القدر کی تلاش:

لیلۃ القدر کا ذکر قرآن حکیم میں دو جگہ کیا گیا اور دونوں مقامات پر اس کی وجہ تشریف یعنی نزول قرآن بھی مذکور ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

(۱) صحیح مسلم' کتاب الاعتکاف' باب الاجتھاد فی العشر الاواخر من شھر رمضان۔

(۲) صحیح البخاری' کتاب الاعتکاف' باب الاعتکاف فی العشرالاواخر والاعتکاف فی المساجد کلھا.....

﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰہُ فِیْ لَیْلَۃِ الْقَدْرِ ۝۱﴾ (القدر)

''بلاشبہ ہم نے اس قرآن کو لیلۃ القدر میں نازل کیا۔''

اور سورۃ الدخان میں فرمایا:

﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰہُ فِیْ لَیْلَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ﴾ (آیت ۳)

''بے شک ہم نے اس قرآن حکیم کو نازل کیا ہے برکت والی رات میں۔''

اور آپ ﷺ نے اپنا فرضِ منصبی ادا کرتے ہوئے اس کی تعیین فرمائی کہ لیلۃ القدر کو رمضان کے آخری عشرے میں تلاش کرو۔(متفق علیہ)

دیگر روایات طاق راتوں یعنی اکیس' تیئیس' پچیس' ستائیس کے تعیّن پر بھی مشیر ہیں (اثر عن ابن عباس ؓ)۔ایک روایت میں حضرت عائشہ صدیقہ ؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ کون سی شب "لیلۃ القدر" ہے تو میں اُس میں کیا دعا کروں؟ آپ ﷺ نے یہ دعا تلقین فرمائی:

((اَللّٰھُمَّ اِنَّکَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّی)) (۱)

۹۔نیک اعمال کی کثرت:

اس ماہ مبارک میں خصوصیت کے ساتھ نیک اعمال کی کثرت کرنی چاہیے۔ایک اعتبار سے یہ نیکیوں کا موسم بہار ہے جس میں اعمال صالحہ کی ادائیگی کے لیے عمومی فضا بنی ہوتی ہے۔اس مقام پر رفقائے تنظیم نیکی کے جامع تصوّر (بحوالہ آیۃ البر) کو ذہن میں تازہ کر لیں۔

حدیث کے الفاظ ہیں:

((اِذَا جَاءَ رَمَضَانُ فُتِّحَتْ اَبْوَابُ الْجَنَّۃِ وَغُلِّقَتْ اَبْوَابُ النَّارِ وَصُفِّدَتِ الشَّیَاطِیْنُ)) (۲)

''جب رمضان آتا ہے تو جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور جہنم کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں اور شیاطین کو جکڑ دیا جاتا ہے۔''

۱۰۔مناجات کی کثرت:

قرآن مجید میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے جس رکوع میں رمضان المبارک کے روزوں کا

(۱) سنن الترمذی' کتاب الدعوات عن رسول اللّٰہ ﷺ۔

(۲) صحیح مسلم' کتاب الصیام' باب فضل شھر رمضان۔ عن ابی ھریرہ ؓ

تذکرہ فرمایا ہے اُس کے ساتھ ہی یہ آیت وارد ہوئی ہے، جس میں ارشاد باری ہے:

﴿وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ؕ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ﴾ (البقرۃ:۱۸۶)

''اور (اے نبی ﷺ) جب بھی آپ سے پوچھیں میرے بندے میرے بارے میں تو (انہیں بتا دیجئے کہ) میں بہت قریب ہوں، میں جواب دیتا ہوں ہر پکارنے والے کی پکار (دعا) کا جب بھی وہ مجھے پکارتا ہے، پس انہیں چاہیے کہ وہ بھی مجھے لبیک کہیں (میرا کہنا مانیں) اور مجھ پر ہی ایمان رکھیں۔''

اس مقام پر اس آیت کے وارد ہونے سے مفسرین نے استدلال کیا ہے کہ رمضان المبارک میں دعاؤں اور مناجات کا خاص اہتمام کرنا چاہیے۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے افطار کے وقت دعا کی قبولیت کا قول ملتا ہے۔ ویسے بھی ہر رات اللہ تبارک وتعالیٰ آخری پہر کو آسمان دنیا پر نزول فرماتے ہیں اور مانگنے والوں کو اُن کی مراد عطا کی جاتی ہے (بخاری)۔ رمضان المبارک میں قیام اللیل کے ساتھ مناجات کی کثرت کرنی چاہیے۔

تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ

رمضان المبارک اور اجتماعی امور

اُمّتِ مسلمہ اپنے سیاسی زوال کے ساتھ جس مصیبتِ عظیمہ سے دوچار ہوئی وہ یہ تھی کہ تصورِ دین عملاً محدود ہو کر رہ گیا۔ اسلام کی وہ جامعیت کہ جس میں فرد کے تزکیہ سے لے کر حکومت واقتدار کے اعلیٰ ایوانوں تک کی اصلاح شامل تھی، صرف قصۂ ماضی بن کر رہ گئی۔ یعنی انسانی زندگی کے انفرادی گوشوں سے لے کر اجتماعی گوشوں تک کو خدا پرستی کے رنگ میں ڈھالنے کی فکر مسلمانوں کے اجتماعی شعور ہی سے خارج ہوگئی۔ چنانچہ رمضان المبارک کے ساتھ بھی یہی ظلم کیا گیا کہ اسے صرف انفرادی تقویٰ وتدین تک محدود کر دیا گیا اور رمضان کے دوران کسی اجتماعی جدوجہد کو محدود مذہبیت نے اپنے ہاں بار نہ دیا۔ اسی طرح رمضان المبارک کے اختتام پر عیدالفطر جیسے عظیم الشان موقع کو بھی صرف ایک رسم بنا کر رکھ دیا گیا، جبکہ عیدالفطر مسلمانوں کی اجتماعیت کا بھرپور اظہار ہے اور تکبیر رب کا پُرزور اعلان!! از روئے الفاظ قرآنی:

﴿وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ﴾ (البقرۃ:۱۸۵)

گزشتہ صدی میں قافلۂ ملّی کے حُدی خواں علامہ اقبال نے اس صورت حال کا مرثیہ اس طرح کہا تھا:

عیدِ آزاداں شکوہِ ملک و دیں
عیدِ محکوماں ہجومِ مؤمنیں!

اور

نماز و روزہ و قربانی و حج
یہ سب باقی ہیں تُو باقی نہیں ہے!

رمضان المبارک اور روزے کے اجتماعی فوائد مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ کے مذکورہ لٹریچر میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ سیرت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ہاں رمضان المبارک صرف انفرادی برکات اور حصولِ ثواب کے مواقع ہی نہیں لاتا تھا بلکہ میدان کارزار میں حق و باطل کی کشاکش بھی اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ اس ماہِ مبارک میں جاری رہی۔ چنانچہ یومِ بدر جسے اللہ تعالیٰ نے ''یوم الفُرقان'' (حق و باطل میں فرق کر دینے والا دن) قرار دیا، رمضان المبارک ۲ ہجری میں پیش آیا۔ دیکھئے کیسی مناسبت ہے کہ قرآن حکیم کو بھی اللہ تعالیٰ نے ''فرقان'' سے تعبیر فرمایا اُسی آیت میں جس میں روزہ کی فرضیت کا تذکرہ ہے۔

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ﴾ (البقرۃ:۱۸۵)

''رمضان وہ مہینہ ہے کہ جس میں قرآن نازل کیا گیا، لوگوں کے لیے ہدایت بنا کر اور ہدایت کی واضح نشانیوں اور حق و باطل کے درمیان امتیاز کے کھلے دلائل کے ساتھ۔''

معلوم ہوا کہ اس ماہ مبارک میں دو ''فرقان'' ہیں، یعنی ایک تو قرآن جو حق و باطل کے درمیان دلیل کی قوت سے فرق کرنے والا ہے اور دوسرا ''فرقان'' غزوۂ بدر ہے جو عالمِ واقعہ میں بالفعل حق و باطل میں فرق کا سبب بنا۔ یومِ بدر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو غلبہ دیا اور کفار کو ذلّت آمیز شکست سے دوچار کیا۔ دکھانا یہ مقصود ہے کہ رمضان المبارک میں رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم انفرادی اعمالِ خیر کے ساتھ غلبۂ دین کی جِدّوجُہد کو بھی جاری رکھے ہوئے تھے۔ رفقائے تنظیم اسلامی کے لیے رمضان المبارک کے دوران یہ پہلو بھی

انتہائی اہم ہے۔ تنظیم اسلامی نے اپنے لیے جو طریقۂ کار اور منہج اختیار کیا ہے اُس کی رو سے مراحل انقلاب میں سے دعوت‘ تربیت اور تنظیم کے مراحل اس وقت درپیش ہیں۔ اس نسبت سے رفقاء تنظیم کی ان تینوں ضروریات کو رمضان المبارک باحسن وجوہ پورا کرتے ہوئے بھرپور دعوتِ عمل ہمارے سامنے رکھتا ہے۔

تنظیم اسلامی کے تحت دورۂ ترجمۂ قرآن کی محافل

دورۂ ترجمۂ قرآن کی محافل کے انعقاد سے رفقائے تنظیم اسلامی کو منہج نبوی ﷺ کے ان تینوں مراحل پر عمل کے مواقع میسّر آتے ہیں۔

۱۔ دعوت:

رمضان المبارک کی آمد سے قبل ہی دورۂ ترجمۂ قرآن کی محافل کے لیے تیاریوں کا آغاز کر دیا جاتا ہے‘ جن میں سب سے اہم کام دعوت ہی کا ہوتا ہے۔ قرآن کی دعوت کو عام کرنے اور اس کے انقلابی پیغام کو لوگوں تک پہنچانے کا یہ بہترین موقع ہوتا ہے۔ رمضان میں دل نرم ہوتے ہیں‘ اذہان نیکی کی طرف مائل ہوتے ہیں اور دین داری کی ایک عمومی فضا بنی ہوتی ہے۔ اس بنا پر لوگوں کو دعوت دے کر دورۂ ترجمۂ قرآن کی محافل میں شریک کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر رفیق داعی الی اللہ کا کردار ادا کرے اور موقع کی اہمیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس سے بھرپور فائدہ اٹھائے۔ اپنے دوست احباب کو اس محفل کی برکتوں سے روشناس کروائے اور اپنے اہل وعیال کے ساتھ ان محافل میں شریک ہو۔ جاننا چاہیے کہ دعوت کا کام دورۂ ترجمۂ قرآن سے قبل ہی مکمل نہیں ہو جاتا بلکہ دورے کے دوران بھی جو احباب پروگرام میں شریک ہو رہے ہوں اُن سے ربط وضبط پیدا کیا جائے اور رمضان المبارک کے بعد انہیں مقامی حلقہ جاتِ قرآنی سے منسلک کرنے کی کوشش کی جائے۔

۲۔ تربیت:

ویسے تو ماہِ رمضان ہے ہی تربیت کا مہینہ‘ مگر دورۂ ترجمۂ قرآن کی محافل میں رفقائے تنظیم کے لیے فکری وعملی تربیت کا بہت سا سامان ہے۔ رمضان کی راتوں میں قرآن کے ساتھ قیام‘ روح کی بالیدگی اور تروتازگی کا ذریعہ ہے۔ ساتھ ہی یہ داعیٔ دین کی ناگزیر ضرورت ’’علمِ دین‘‘ کو بھی کسی درجہ میں پورا کرتا ہے۔ وہ افراد جو تحریک رجوع الی القرآن سے وابستہ ہوں

اور خود خادمِ قرآن اور داعیٔ قرآن ہوں ان کے لیے انتہائی ضروری ہے کہ قرآن حکیم کے ترجمے اور مفاہیم سے خوب واقف ہوں۔ دورۂ ترجمۂ قرآن میں شعوری اور کُل وقتی شرکت اس ضرورت کو پورا کرتی ہے۔

یہ قرآن حکیم ہی ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ کا آلۂ انقلاب بھی تھا اور آلۂ تربیت بھی۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ﴾ (الجمعہ:۲)

’’وہی ہے (اللہ) جس نے رسول بھیجا اُمّیین میں انہیں میں سے‘ وہ ان پر اللہ کی آیات تلاوت کرتے ہیں‘ ان کا تزکیہ کرتے ہیں‘ اور انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتے ہیں۔‘‘

۳۔ تنظیم:

دورۂ ترجمۂ قرآن کی محافل کا انعقاد بلاشبہ ایک مشکل امر ہے‘ مسلسل تیس روز تک باقاعدگی کے ساتھ منظّم انداز میں کسی محفل کو منعقد کرنے کے لیے کافی محنت اور یکسوئی درکار ہے۔ رفقاء جب احساسِ فرض کے تحت اپنے بالاتر نظم کے احکامات پر سمع وطاعت اور عمدگی کے ساتھ عمل کریں تو ہی ان محافل کو حسن وخوبی کے ساتھ منعقد کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ دورانِ ماہِ رمضان سمع وطاعت کے جذبے کو تازہ رکھا جائے۔

رمضان المبارک اور انفاقِ مال

انفاق کے حوالے سے ہم جانتے ہیں کہ ایک ہے فرض انفاق یعنی زکوٰۃ اور دوسرا ہے نفلی انفاق۔ اکثر افراد کا معمول ہے کہ رمضان المبارک میں زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔ یہ بات اس اعتبار سے مناسب ہے کہ زکوٰۃ قمری تقویم سے فرض ہوتی ہے تو حساب میں سہولت رہتی ہے۔ ادائیگیٔ زکوٰۃ کا اہتمام ضروری ہے۔ چونکہ یہ ایک عبادت ہے (ٹیکس یا چیریٹی نہیں) لہٰذا لازم ہے کہ اس کی ادائیگی شریعت میں معیّن طرز پر کی جائے۔ ہر صاحبِ نصاب پر اس کے احکام ومسائل کا جاننا ضروری ہے۔ نفلی انفاق کی مزید دو اقسام ہیں۔ ایک وہ جو اللہ کی مخلوق پر خرچ کیا جائے جسے عوام صدقات وخیرات سے تعبیر کرتے ہیں اور دوسری قسم وہ ہے جو اللہ کے

دین کے لیے خرچ کیا جائے‘ یعنی اجتماعی فرائض کی ادائیگی‘ جیسے اللہ کے دین کی سربلندی کی جدّوجُہد‘ دینی علوم کی نشرواشاعت وغیرہ پر‘ اسے اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے ذمّہ قرض سے تعبیر کرتے ہیں۔ وعدۂ ربانی ہے:

﴿مَنْ ذَاالَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَہٗ لَہٗٓ اَضْعَافًا کَثِیْرَۃً ط﴾

(البقرۃ:۲۴۵)

’’کون ہے جو اللہ تبارک وتعالیٰ کو قرض دے — بہترین قرض — کہ وہ (اللہ تعالیٰ) اسے بڑھائے چڑھائے اس کے لیے‘ کئی گنا زیادہ۔‘‘

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما رسول اللہ ﷺ کی رمضان المبارک میں سخاوت کا حال یوں بیان کرتے ہیں:

((کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اَجْوَدَ النَّاسِ وَکَانَ اَجْوَدُ مَا یَکُوْنُ فِیْ رَمَضَانَ حِیْنَ یَلْقَاہُ جِبْرِیْلُ‘ وَکَانَ جِبْرِیْلُ یَلْقَاہُ فِیْ کُلِّ لَیْلَۃٍ مِنْ رَمَضَانَ فَیُدَارِسُہُ الْقُرْآنَ‘ فَلَرَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ حِیْنَ یَلْقَاہُ جِبْرِیْلُ اَجْوَدُ بِالْخَیْرِ مِنَ الرِّیْحِ الْمُرْسَلَۃِ))(۱)

’’رسول اللہ ﷺ تمام لوگوں سے زیادہ سخی تھے اور خصوصاً رمضان میں آپ ﷺ کی سخاوت اور بڑھ جاتی تھی جب حضرت جبریل علیہ السلام آپ ﷺ سے ملاقات کرتے تھے۔ اور جبریل علیہ السلام رمضان کی ہر شب آپ ﷺ سے ملاقات کرتے تھے اور آپؐ ان سے قرآن کا دور فرمایا کرتے تھے۔ جب رسول اللہ ﷺ جبریل علیہ السلام سے ملاقات کرتے تو آپؐ کی سخاوت تیز ہوا سے بھی زیادہ بڑھ جاتی تھی۔‘‘

ہم نے انفاق فی سبیل اللہ کا تذکرہ انفرادی امور اور اجتماعی امور دونوں کے بعد کیا ہے اس لیے کہ یہ عمل دونوں کا جامع ہے۔ لہٰذا اللہ کی راہ میں رمضان المبارک کے دوران زیادہ سے زیادہ خرچ کرنا چاہیے اور جو تقسیم ذکر کی گئی ہے اُن سب کو خرچ کرتے وقت ملحوظ رکھنا چاہیے۔

ربّ کریم سے دعا ہے کہ ہمیں رمضان المبارک کی ساعتوں سے خوب بہرہ ور فرمائے اور جو کچھ گزارشات کی گئیں ان پر سب سے پہلے راقم کو اور تمام رفقاء تنظیم اسلامی کو اخلاص کے ساتھ عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب بدء الخلق‘ باب ذکر الملائکۃ۔

یومُ الفرقان در ماہِ رمضان

(ماہِ رمضان میں یوم الفرقان یعنی غزوۂ بدر کا منظر)

زمینِ بدر تک جب آ گیا سیلِ سیہ کاری
مدینے سے اٹھا نورِ خدا بہرِ ضیا باری

مبارک جمعہ کا دن تھا‘ سترہویں تھی ماہِ رمضاں کی
شہادت گاہ میں فوج آ ہی پہنچی اہلِ ایماں کی

عجب انداز سے آئے خدا کے چاہنے والے
زبانیں خشک پوشاکیں دریدہ پاؤں میں چھالے

یہ اس قربان گاہ میں آج پیدل چل کے آئے تھے
نہا کر اوس میں اور دھوپ میں جل جل کے آئے تھے

نہ ان کے پاس تلواریں نہ ان کے پاس ڈھالیں تھیں
نہ غلّہ ان کے اونٹوں پر نہ پانی کی پکھالیں تھیں

عَلَم خورشید کا ان کے سروں پر سایہ افگن تھا
کہ یہ اک ایک چہرہ نورِ عرفانی کا مخزن تھا

مئے وحدت سے قلبِ مطمئن سرشار تھا ان کا
کہ سردارِ دو عالم ﷺ قافلہ سالار تھا ان کا

انہی کا فرض تصویرِ وفا میں رنگ بھرنا تھا
رگِ ہستی کو اپنے خون سے سیراب کرنا تھا

نہیں تھا تین سو تیرہ کے آگے تک شمار ان کا
سنا یہ ہے کہ ان کے ساتھ تھا پروردگار ان کا

اِدھر روشن ہوئی روئے نبی ﷺ سے بدر کی وادی
اُدھر پائی شہِ خاور نے دامِ شب سے آزادی

بیاباں کے عظیم الشان منظر سے اٹھے پردے
کہ جیسے قلب میں کوئی فرشتہ معرفت بھر دے

ہوئی جب روشنی تو آسماں والوں نے کیا دیکھا
زمیں پر نور وظلمت کا نرالا معرکہ دیکھا

کھڑی تھی ایک مٹھی بھر جماعت حق پسندوں کی
بھری دنیا سے منہ موڑے ہوئے دیندار بندوں کی

نہتے بے سروسان بھوکے اور تھکے ہارے
کہ مل کر تین سو تیرہ جوان و پیر تھے سارے

کئی تھی زندگی جن کی ریاضت میں عبادت میں
شہادت کے لیے آئے تھے میدانِ شہادت میں

پتا دیتی تھی ان کی خاکساری سربلندی کا
نگاہوں میں مرقع تھا دلوں کی دردمندی کا

یہ آئے تھے کہ شمعِ دینِ حق کا بول بالا ہو
پتنگے جل بجھیں لیکن اندھیرے میں اُجالا ہو

یہ مرگ وزندگی میں فیصلہ کرنے کو آئے تھے
جوانمردوں کی صورت مارنے مرنے کو آئے تھے

یہ پہلا جیش تھا دنیا میں افواجِ الٰہی کا!
جسے اعلان کرنا تھا خدا کی بادشاہی کا!!

یہ لشکر ساری دنیا سے انوکھا تھا نرالا تھا
کہ اس لشکر کا افسر ایک کالی کملی والاؐ تھا

حفیظ جالندھری

سقوطِ خلافت اور اُمّتِ مُسلمہ کی ذِمّہ داری

ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر ☆

۲۸ رجب ۱۳۴۲ھ/ ۳ مارچ ۱۹۲۴ء کا دن اُمّتِ مسلمہ کے لیے کسی المیہ سے کم نہیں تھا۔ اس دن تیرہ سو اکتیس سال سے قائم خلافت کا خاتمہ کیا گیا۔ مزید دکھ کا مقام یہ ہے کہ خلافت کے خاتمے پر تین چوتھائی صدی کا عرصہ گزر جانے کے باوجود اور اس حقیقت کے باوجود کہ خلافت امورِ عامہ میں سے ہے' شارع نے اس کے انعقاد کی ذمہ داری اُمّتِ مسلمہ پر عائد کی ہے' ادارۂ خلافت کے قیام کی کوئی باقاعدہ ٹھوس کوشش نہیں کی گئی' درآں حالیکہ ائمہ اسلام کی اکثریت کے مطابق ''انتخابِ خلیفہ'' اُمتِ محمدی پر فرضِ کفایہ کے طور پر لازمی ہے۔ اگر اس فریضہ کو انجام نہ دیا گیا تو تمام امت اس کی ذمہ دار ہوگی اور اس کے لیے قابلِ مواخذہ ہوگی' اور اگر اُمتِ مسلمہ میں کسی بھی جگہ کے اربابِ حل وعقد (اہلِ اختیار) نے اسے منعقد کر دیا تو ساری اُمت کے سر سے یہ فرض ساقط ہو جائے گا۔

تشریح خلافت

''خلافت'' عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی نیابت اور قائم مقامی کے ہیں۔ اسی سے لفظ خلیفہ (جمع خلفاء) ہے جس کے معنی جانشین یا قائم مقام کے ہیں (۱)۔ قرآنِ مجید میں لفظ ''خلیفہ'' دو بار آیا ہے (۲)۔ جبکہ یہ لفظ اپنے اشتقاقی معنوں میں متعدد بار استعمال ہوا ہے (۳) تاہم ہر جگہ یہ لفظ نیابت اور جانشینی ہی کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اسلامی تاریخ میں ''خلافت'' اس ادارے کو کہتے ہیں جو اُمتِ مسلمہ کے مرکز کی حیثیت رکھتا ہو اور خلیفہ اس ادارے کا سربراہ ہوتا ہے۔

یہاں اس غلط فہمی کا تدارک ضروری ہے جو عموماً لوگوں میں ناواقفیت کی بنا پر پھیلی ہوئی ہے۔ عموماً سمجھا جاتا ہے کہ خلافت کوئی دینی ادارہ ہے اور خلیفہ کی محض ایک رسمی مذہبی حیثیت

☆ پروفیسر شعبہ اسلامی تاریخ' جامعہ کراچی

ہوتی ہے جس کا کام چند مذہبی رسوم کی ادائیگی سے زیادہ کچھ نہیں۔ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ شارع کا فیصلہ ہے کہ خلافت دینی اور دُنیوی دونوں امور پر محیط ہو۔ اسلام انسان کی روحانی اور اخلاقی راہنمائی کے ساتھ ساتھ مادی معاملات میں بھی مکمل راہنمائی فراہم کرتا ہے اور مذہب اور سیاست کو الگ الگ خانوں میں تقسیم کرنے کے بجائے زندگی کے ہمہ گیر ضابطۂ حیات کے لیے ''دِین'' کی جامع اصطلاح استعمال کرتا ہے۔ اس لیے خلافت کا منصب بھی زندگی کے تمام امور پر محیط ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی دو حیثیتیں ہیں' ایک یہ کہ وہ رسول تھے اور اس اعتبار سے ان کا بنیادی فریضہ منصبِ نبوت کی ذمہ داریاں سنبھالنا اور دینِ حق کی اشاعت میں کما حقہٗ سعی کرنا تھا' جبکہ ان کی دوسری حیثیت ملّتِ اسلامیہ کے قائد اور راہنما کی تھی' لہٰذا اس اعتبار سے ان کا کام وہی تھا جو کسی سربراہِ مملکت یا حکمرانِ وقت کا ہو سکتا ہے۔ لہٰذا رسول اللہ ﷺ کے بعد ان کے خلفائے راشدین (رضی اللہ عنہم) اُمت کے دینی اور روحانی رہنما ہونے کے ساتھ ساتھ امورِ حکمرانی و جہانبانی میں بھی امت کے قائد و امام تھے۔

اس حوالے سے مسلمانوں کے خلیفہ کی حیثیت عیسائیوں کے پوپ کی حیثیت سے بالکل جداگانہ ہے۔ مسلمانوں کا خلیفہ زمین پر رسول اللہ ﷺ کا نائب ہے اور زمین پر اُسے مکمل حکومت اور اختیار حاصل ہوگا' جبکہ مسیحیت کے پوپ کی محض ایک رسمی مذہبی حیثیت ہوتی ہے اور اس کا اقتدار محض آسمانی اور دینی اقتدار ہوتا ہے جس کے لیے دلوں کا اعتقاد اور پیشانیوں کا سجدہ کافی ہوتا ہے۔

ایک اور لائقِ توجّہ بات یہ ہے کہ اسلامی ماخذ میں ''خلافت'' کے ساتھ ساتھ ''امامت'' کا لفظ بھی متداول اور مروّج ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کے حکمرانوں کے لیے خلیفہ' امام' امیر' امیر المسلمین' امیر المؤمنین یا اولی الامر وغیرہ کے الفاظ استعمال ہو سکتے ہیں۔ اس اعتبار سے خلیفہ اور امیر نیز خلافت و امامت مترادف الفاظ ہیں۔

تاریخِ خلافت

خلافت کی تاریخ حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوتی ہے۔ وہ اس دنیا میں اللہ کے پہلے بندے' نبی اور خلیفہ تھے' جس کی طرف سورۃ البقرۃ' آیت ۳۰ میں اشارہ کیا گیا ہے۔ ان کے بعد زمین کی وراثت و خلافت یکے بعد دیگرے مختلف قوموں کے سپرد ہوتی رہی۔ خلافتِ ارضی کا بنیادی وظیفہ بھی قرآن نے بتا دیا تھا کہ دنیا میں صرف اللہ کی عبادت کی جائے' نیکیوں کو قائم

کیا جائے اور برائیوں کا سدّباب کیا جائے۔(۴)

ظہورِ اسلام کے بعد جب ارضی خلافت کے وارث مسلمان ہوئے تو اس سلسلہ کے پہلے خلیفۃ اللہ' خود رسول اللہ ﷺ تھے۔ ان کے بعد ان کے نائب اور جانشین کے طور پر جو صحابہ کرامؓ یکے بعد دیگرے آئے وہ سب خلفاء کہلائے اور یہ سلسلہ صدیوں تک چلتا رہا۔

رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد آپ کی جانشینی کا مسئلہ اٹھا' جسے مختصر بحث ومباحثہ کے بعد طے کر لیا گیا اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پہلے متفق علیہ ''خلیفۂ رسول اللہ'' کے طور پر منتخب ہوئے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت ربیع الاول ۱۱ ہجری/ جون ۶۳۲ء میں ہوئی۔ ابتدائی چار خلفاء کے دور کو ''خلافتِ راشدہ'' کا دور کہا جاتا ہے۔ دورِ خلافتِ راشدہ دراصل دورِ نبوت کا تسلسل تھا' جس میں حکومت واقتدار کے نہ اصول بدلے نہ معیارات۔ لہٰذا یہ دور ''خلافت علیٰ منہاج النبوّۃ'' کہلاتا ہے۔ یہ صالح اور متقی خلفاء (حضرات ابوبکرؓ' عمرؓ' عثمانؓ اور علیؓ) کا وہ عہد حکومت ہے جسے اُمتِ محمدیہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کی اجتماعی تائید وحمایت حاصل تھی۔ اگرچہ خلافت کا یہ سلسلہ اس کے بعد بھی صدیوں جاری رہا' تاہم خلافتِ راشدہ کے دَور کو اس کی خصوصیات کی بنا پر ''خلافتِ خاصّہ'' سے تعبیر کیا جاتا ہے اور بعد کے زمانہ خلافت کو ''خلافتِ عامّہ'' کہا گیا ہے۔

خلافتِ راشدہ کے بعد' خلفائے بنوامیہ کا دور تقریباً ۹۲ سال رہا (۴۱ ہجری/ ۶۶۱ء تا ۱۳۲ ہجری/ ۷۵۰ء) اور اس دوران چودہ خلفاء نے حکومت کی۔ اس کے بعد عباسی خلفاء کا دور ہے' اس دور میں انہوں نے بغداد سے حکومت کی۔ پانچ سو سال سے زائد قائم رہنے والا یہ اقتدار بالآخر ہولاکو خان (Hologu Khan) کی فوجوں کے ہاتھوں زیر و زبر ہو گیا۔ ۳۷ ویں عباسی خلیفہ مستعصم باللہ کو ہولاکو خان نے اپنے سامنے اتنے کوڑے لگوائے کہ ۴ صفر ۶۵۶ ہجری/ ۱۰ فروری ۱۲۵۸ء میں خلیفہ نے شہادت پائی اور سقوطِ بغداد کا عمل مکمل ہو گیا۔ فارسی کے مشہور شاعر سعدی شیرازی اس زمانے میں زندہ تھے' انہوں نے اس حادثۂ خونچکاں سے متاثر ہو کر جو مرثیہ لکھا اس کا پہلا شعر یہ ہے: ؎

آسماں راحق بود گر خوں ببارد بر زمیں
بر زوالِ مُلکِ مستعصم امیر المؤمنیں

اس کے بعد دو سال تک خلافت موقوف رہی۔ دو سالہ تعطّل کے بعد خلافتِ عباسیہ کا دوسرا دَور' قاہرہ (مصر) سے شروع ہوا۔ وہ اس طرح کہ ۳۶ ویں عباسی خلیفہ مستنصر باللہ کا

بھائی ابوالقاسم احمد بن الظاہر بامر اللہ کسی نہ کسی طرح ہولاکو کے قتلِ عام سے بچ کر مصر پہنچ گیا۔ وہاں ان دنوں چوتھا مملوک حکمران ملک بیبرس تھا۔ خلافت کو چونکہ مسلمانوں کے نزدیک تقدس اور برتری کا اہم ترین مقام حاصل تھا لہٰذا ملک ظاہر بیبرس نے اسے غنیمت سمجھا کہ اس کے ہاتھوں خلافت کا احیاء ہو جائے۔ چنانچہ اس نے ابوالقاسم احمد کو خلیفہ بنا کر ۶۵۹ ہجری میں اس کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ نئے خلیفہ نے مستنصر باللہ (ثانی) کا لقب اختیار کیا۔ یوں مصر میں عباسی خلافت کا دوسرا دور شروع ہوا۔ اس دور میں سترہ خلفاء گزرے۔ بحیثیت مجموعی ان خلفاء کی حیثیت مملوک سلاطین کے مقابلے میں کمزور تھی' تاہم اس منصب کا ایک وقار تھا جو کسی نہ کسی حد تک قائم رہا۔

جب سلطنتِ عثمانیہ کے نویں حکمران سلطان سلیم اوّل کے ہاتھوں ممالکِ مصر کا اقتدار ختم ہو گیا تو مصر میں کچھ عرصہ قیام کے بعد یہاں سے واپس جاتے ہوئے سلیم اوّل نے آخری خلیفہ المتوکل علی اللہ ثالث کو بھی اپنے ہمراہ لے لیا اور قسطنطنیہ میں اس کی رہائش اور قیام وطعام کا معقول بندوبست کر دیا۔ تاہم المتوکل نے اس بے اختیار خلافت سے دست برداری کا اعلان کر دیا اور خود سلیم اول کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ یوں خلافت عباسیوں سے عثمانیوں میں منتقل ہو گئی۔ یہ ۹۲۳ھ/ ۱۵۱۸ء کا واقعہ ہے۔ چونکہ اس وقت ترکوں کا ستارہ اوجِ کمال پر تھا لہٰذا خلافت ایک مضبوط ادارہ کی شکل اختیار کر گئی۔ سوائے ایران کی صفوی حکومت کے ہر حکومت کے فرمانروا خلیفۂ وقت سے فرماں روائی کی سند حاصل کرنے کو اپنی کامیابی سمجھتے تھے۔ جن ممالک میں مسلمان اقلیّت میں تھے وہ بھی ادارۂ خلافت سے قوت اور طاقت حاصل کرتے تھے اور خلیفہ ان کا بھی مربّی سمجھا جاتا تھا۔ شمسی اعتبار سے چار سو چھ سال تک اور قمری حساب سے چار سو انیس سال تک یہ خلافت عثمانیوں کے پاس رہی' جس میں ۱۹ خلفاء کچھ طاقتور' کچھ کمزور گزرے' تا آنکہ ۱۳۴۲ھ/ ۱۹۲۴ء کو مصطفیٰ کمال پاشا نے خلافت کے خاتمے کا اعلان کیا۔ ؎

چاک کردی ترکِ ناداں نے خلافت کی قبا
سادگی اپنوں کی دیکھ' اوروں کی عیاری بھی دیکھ!

خلافت کے ادارے کے خاتمے کے پیچھے استعماری اور صیہونی عزائم کارفرما تھے۔(۵) تاریخ کے صفحات سے وہ الفاظ کھرچ کر نکالے نہیں جا سکتے جو خاتمۂ خلافت کے بعد لارڈ کرزن کے منہ سے ادا ہوئے۔ اُس نے House of Common میں اپنا دفاع کرتے ہوئے کہا تھا:

"The point at issue is that Turkey has been destroyed and shall never rise again, because we have destroyed her spiritual power : The Caliphate and Islam." (۶)

(اس مسئلہ میں اہم نکتہ یہ ہے کہ ترکی تباہ کیا جا چکا ہے اور اب کبھی اُبھر نہیں سکتا' کیونکہ ہم نے اس کی روحانی طاقت یعنی خلافت اور اسلام کو تباہ کر دیا ہے۔)

پہلی جنگ عظیم کے دوران اتحادیوں (برطانیہ اور فرانس) نے جب یہ سمجھ لیا کہ محوری طاقتوں (جرمنی' اٹلی اور خلافتِ عثمانیہ) کو با آسانی شکست نہیں دی جا سکے گی تو انہوں نے حسبِ سابق گھناؤنی سازشیں شروع کیں۔ عربوں کو عثمانیوں کے خلاف کھڑا کیا گیا۔ عرب قومیت کا تصور اور حجاز کی حکومت کا لالچ دے کر شریفِ مکہ' حسین بن علی کو استعمال کیا' جس کے نتیجے میں عربوں نے ترکوں کے خلاف بغاوت کر دی اور عثمانی جنگ ہارنے لگے۔

برطانیہ کے ساتھ ساز باز کے نتیجے میں شریف حسین نے حجاز کی حکومت حاصل کر لی تھی' اور اس کے بیٹے فیصل کو عراق کا حکمران بنا دیا گیا تھا۔ پہلے شریفِ مکہ نے سلطانِ عرب ہونے کا اعلان کیا' پھر جب ترکی سے خلافت کا خاتمہ کر دیا گیا تو اُس نے ۷ مارچ ۱۹۲۴ء کو ''خلیفۃ المسلمین'' کا بھی لقب اختیار کر لیا۔ اس کے پاس سب سے بڑی دلیل یہ تھی کہ اس کا مقاماتِ مقدسہ (مکّہ اور مدینہ) پر کنٹرول ہے اور یہ کہ وہ ہاشمی النسب ہے۔ لیکن چونکہ جنگ عظیم اوّل کے دوران ۱۹۱۶ء میں اس نے ترکوں کے خلاف بغاوت کر کے عالم اسلام کی ناراضگی مول لی تھی لہٰذا اس کی یہ خلافت اُمتِ مسلمہ کے نزدیک قابلِ قبول نہیں ہو سکتی تھی۔ اقبال کہتے ہیں ؎

بیچتا ہے ہاشمی ناموسِ دینِ مصطفٰے
خاک و خوں میں مل رہا ہے ترکمانِ سخت کوش

شریفِ مکہ کا انجام اچھا نہیں ہوا' جلد اُسے اپنے دیرینہ حریف عبدالعزیز بن سعود کے ہاتھوں شکست کھا کر حجاز سے فرار ہونا پڑا۔ بعد ازاں وہ ۱۳۵۰ھ/۱۹۳۱ء میں قبرص میں نظر بندی کے دوران وفات پا گیا۔

ردِّعمل

خلافت کے خاتمے پر عالمِ اسلام میں غیر معمولی دکھ کا اظہار کیا گیا۔ ہندوستانی مسلمانوں کی طرف سے خصوصاً شدید ردِّعمل سامنے آیا۔ ''خلافت'' کی جو شرعی حیثیت تھی اس کی وجہ سے

ہر مسلمان اپنی جگہ مضطرب تھا۔ یہ شارع کا فیصلہ ہے کہ ہر زمانے میں مسلمانوں کا ایک خلیفہ اور امیر ہو جو مسلمانوں کی اور ان کی آبادیوں کی حفاظت کرے' شریعت کا اجراء اور نفاذ کرے اور دشمنوں کے مقابلے کے لیے پوری طرح تیار رہے۔ یہ بھی شارع کا فیصلہ ہے کہ خلیفہ کی اطاعت و اعانت کی جائے جب تک وہ (یعنی خلیفہ / امیر) اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے خلاف حکم نہ دے (۷) اور اس سے کفرِ بواح (صریح کفر) ظاہر نہ ہو۔ جو مسلمان خلیفہ کی اطاعت سے باہر ہوا وہ گویا اسلامی جماعت سے باہر ہو گیا۔ جس مسلمان نے خلیفہ کے مقابلے میں لڑائی کی یا لڑنے والوں کی مدد کی اس نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے مقابلے میں تلوار کھینچی' خواہ وہ نمازی' روزہ دار اور خود کو مسلمان سمجھنے والا ہی کیوں نہ ہو۔

خلیفہ اور خلافت کے حوالے سے جب معاملہ کی نوعیت یہ ہو تو خلافت جیسے اہم ترین ادارے کے خاتمے پر اُمتِ مُسلمہ کا ردِّعمل بھی سمجھ میں آ سکتا ہے۔ چنانچہ ہندوستانی مسلمانوں کا اضطراب ۱۹۱۹ء سے ہی سامنے آنے لگا۔ یوں تو مولانا محمد علی جوہر جنگ عظیم اوّل میں ترکوں کی شمولیت ہی کے سخت خلاف تھے اور انہوں نے عثمانی خلافت کو اس سے باز رہنے کے لیے تار بھی بھجوایا تھا (۸) اور جنگ عظیم کے اختتام پر خلافت کے ادارہ کے تحفظ کے لیے انہی کی سرکردگی میں تحریکِ خلافت چلائی گئی۔ خلافت وفد نے' جو مولانا محمد علی کی سربراہی میں لندن' ازاں بعد فرانس اور اٹلی گیا' بڑی وضاحت سے اپنے مطالبات پیش کیے:

☆ یہ کہ خلافت کو بحال رکھا جائے۔

☆ یہ کہ خلیفہ کی نگرانی میں مقاماتِ مقدسہ کی حفاظت کی جائے۔

وفد کی ناکامی کے باوجود تحریکِ خلافت کو ہندوستان کے طول و عرض میں کامیاب بنانے کے لیے مسلمانوں زعماء نے انتھک محنت کی' قربانیاں دی گئیں' ترکِ موالات کی حوصلہ افزائی کی گئی' یہاں تک کہ تحریکِ خلافت اور گاندھی جی کی تحریک عدمِ تعاون (Non Cooperation Movement) نے برطانوی اقتدار کی چولیں ہلا دیں۔ لیکن جب خود مصطفٰی کمال نے خلافت کے ادارہ کا خاتمہ کر دیا تو تحریکِ خلافت کو بھی دھچکا پہنچا۔ ہندوستان کی تحریک خلافت کی جگہ' جس کا ساتھ گاندھی اور ہندوؤں نے بھی دیا تھا' ایک جدّت پسند اور خلافت مخالف جماعت آل انڈیا مسلم لیگ نے لے لی' جس نے آگے چل کر ایک آزاد اور خود مختار ریاست کا مطالبہ کر دیا۔ اس مطالبے کو بالآخر مسلمانوں کی اکثریت کی حمایت حاصل ہو گئی۔ ہندوستان کی پرانی

مسلمان قیادت کی جگہ محمد علی جناح‘ لیاقت علی خان اور سر آغا خان وغیرہ نے لے لی۔ ان رہنماؤں کو عالمِ اسلام میں وہ مقام و مرتبہ حاصل نہ تھا جو مولانا حسین احمد مدنی‘ مولانا محمد علی جوہر‘ مولانا شوکت علی‘ سید سلیمان ندوی وغیرہ کو حاصل تھا۔ نئی قیادت نے کُلّی طور پر اپنے آپ کو حصولِ پاکستان کی جِدّوجُہد میں لگا دیا اور اس طرح اُمّہ کی سیاست سے ایک اہم اور سرگرم رکن پیچھے ہٹ گیا یا ہٹا دیا گیا۔

احیاءِ خلافت کے لیے کوششیں

(۱) خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کی تحریک خلافت کے علاوہ چند کوششیں اور کی گئیں۔ ان میں ۱۹۲۶ء میں قاہرہ میں منعقد ہونے والی خلافت کانفرنس سے احیاء خلافت پر غور و خوض شروع ہوا۔ اس کانفرنس کے شرکاء نے ان امور پر غور کیا:

i) خلافت کی تشریح اور خلیفہ کے مطلوبہ اوصاف
ii) کیا اسلام میں خلافت ضروری ہے؟
iii) خلافت کے انعقاد کا طریقہ کار
iv) کیا اس وقت ایسی خلافت قائم کی جا سکتی ہے جو شریعت کے تمام تقاضے پورے کرے
v) اگر نہیں تو کیا اقدام کرنا چاہئے
vi) اگر کانگریس خلیفہ مقرر کرنے کا فیصلہ کرے تو اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کیا کرنا ہوگا؟[۹]

یہ مسلمانوں کی نمائندہ کانفرنس ثابت نہ ہو سکی‘ کیونکہ اس میں بہت سے مسلمان ممالک نے شرکت نہیں کی۔[۱۰] کانفرنس بالآخر اس بات پر پہنچی کہ خلافت کا قائم کرنا دینی فریضہ ضرور ہے لیکن آج مسلمان جن حالات سے دوچار ہیں اس کو مدنظر رکھتے ہوئے سردست خلافت کا احیاء بعید از قیاس ہے۔[۱۱]

اُمتِ مسلمہ کے لیے یہ انتہائی مایوس کن صورتِ حال ہو سکتی تھی‘ چنانچہ ایک نئی قرار داد سامنے لائی گئی جس میں اس بات کی تائید کی گئی کہ خلافت کا احیاء ممکن العمل ہے‘ لہٰذا ایک اور کانگریس کا اہتمام کیا جائے جس میں تمام مسلمانوں کو مناسب طور پر نمائندگی دی جائے اور کانگریس نئے خلیفہ کا انتخاب بھی کرے۔

تاہم ایسی کسی کانگریس کا خواب کبھی بھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

(۲) اس حوالے سے ایک اور کوشش سعودی حکمران کی طرف سے سامنے آئی‘ تاہم وہ قیامِ خلافت کی کوشش سے زیادہ اپنے خاندانی اقتدار کے لیے راستہ ہموار کرنے کی کوشش معلوم ہوتی ہے۔

مئی ۱۹۲۶ء میں قاہرہ میں منعقد ہونے والی خلافت کانفرنس کے خطرے کے پیشِ نظر جولائی ۱۹۲۶ء میں سعودیوں نے مکہ میں ورلڈ مسلم کانگریس کا انعقاد کرایا‘ جس میں انہوں نے خلافت کے متبادل کے طور پر قومی ریاستوں (Nation States) کا نظریہ پیش کیا۔ سعودیوں کو اس سے غرض نہیں تھی کہ قومی ریاستوں کا نظریہ اسلام کے نظامِ حکومت و سیاست کے سراسر منافی ہے‘ انہوں نے صرف یہ دیکھا کہ اس نظام سے حجاز پر ان کی حکمرانی کو دوام حاصل ہو سکتا ہے۔

حج کے موقع پر مکّہ میں منعقدہ اس کانفرنس کو مؤتمر عالمِ اسلامی (World Muslim Congress) کا نام دیا گیا۔ تاہم اس میں حرمین کے حوالے سے تو کئی باتیں زیرِ غور آئیں لیکن خلافت کا تذکرہ تک نہیں کیا گیا۔ بہت سے مسلم زعماء نے اس پر تنقید بھی کی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پھر تیئیس برس تک کانگریس کا کوئی اور اجلاس نہیں بلایا گیا۔

اس ادارہ کا احیاء پاکستان کے حصے میں آیا‘ لہٰذا مؤتمر عالم اسلامی (World Muslim Congress) کا دوسرا اجلاس فروری ۱۹۴۹ء میں پاکستان کے اس وقت کے دارالحکومت کراچی میں منعقد ہوا۔ پاکستان کے پہلے اور آخری شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کو اس کانفرنس کا صدر مقرر کیا گیا۔ کانفرنس کے انعقاد سے چند ماہ قبل بابائے قوم محمد علی جناح کا انتقال ہو گیا تھا۔ تاہم کانگریس کا یہ اجلاس خلافت کے حوالے سے کوئی موقف سامنے نہ لا سکا اور جس طرح پہلی کانفرنس سعودی عرب کی ''قومی ریاست'' کے تصور کے اردگرد گھومتی رہی اسی طرح یہ دوسرا اجلاس بھی ''جدید مسلم قومی ریاستوں'' کی طرف ایک پیش رفت ثابت ہوا۔ فروری ۱۹۵۱ء میں ورلڈ مسلم کانگریس کا ایک اور اجلاس پاکستان میں منعقد ہوا اور مسلم ممالک کے درمیان ایک مشترکہ دفاع کے معاہدے کا اعلان کیا گیا۔ گویا وہ سفر جو ''احیائے خلافت'' کے حوالے سے شروع ہوا تھا ''مسلم قومی ریاستوں کے اتحاد'' کی طرف مڑ گیا‘ اور قیامِ خلافت یا احیائے خلافت کے تصور کو ناممکن العمل قرار دے دیا گیا۔ بالفاظِ دیگر ''احیائے خلافت'' کی کوشش ''اتحادِ اسلامی'' کی کوششوں میں تبدیل ہو گئی‘ اس بات کا ادراک

کیے بغیر کہ ''اتحادِ اسلامی'' کی کوئی بھی کوشش ''قیامِ خلافت'' کے بغیر ممکن نہیں ہو سکے گی۔

آرگنائزیشن آف اسلامک کانفرنس (O.I.C) جس کا قیام مراکش کے شہر رباط میں ستمبر ۱۹۶۹ء میں عمل میں آیا ''اتحادِ اسلامی'' کے عمل کو تیز تر کرنے کی ایک لاحاصل کوشش تھی۔ ''او۔آئی۔سی'' کی کارکردگی مسلمان ملکوں کے حوالے سے کیا ہے' اس پر دو رائے نہیں ہو سکتیں۔

خاتمۂ خلافت کے اثرات

خلافت کے خاتمے پر عالمِ اسلام میں غیر معمولی دکھ کا اظہار کیا گیا۔ مسلمانانِ عالم تو یہی چاہتے ہیں کہ خلافت کا ادارہ دوبارہ قائم ہو جائے' لیکن اسلامی ممالک کے سیاسی زعماء اپنے ذاتی مفادات کی وجہ سے اس میں قطعاً کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔

خلافت کے خاتمے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ عالم اسلام لامرکزیت کا شکار ہو گیا۔ آج ۵۷ اسلامی ممالک ہیں' دنیا کا ہر چوتھا شخص مسلمان ہے' مگر ان کی کوئی متحدہ طاقت نہیں ہے۔ ہر اسلامی ملک اپنی اپنی اکائی میں اپنے اپنے مسائل سے نبرد آزما ہے' بلکہ بعض حالات میں اپنے سیاسی و معاشی مفادات کی وجہ سے دوسرے مسلم ممالک سے دست و گریباں ہے۔ اسی لامرکزیت کی وجہ سے آج اقوامِ عالم میں عددی برتری کے باوجود مسلمانوں کی نہ کوئی آواز ہے نہ کوئی دباؤ۔ لہٰذا مسلمان کبھی بوسنیا اور مقدونیہ میں مارا جاتا ہے تو کبھی شیشان اور افغانستان میں اس کا قتل عام ہوتا ہے اور سارا عالمِ اسلام ''ٹک ٹک دیدم' دم نہ کشیدم'' کی تصویر بن جاتا ہے۔ اقوام متحدہ میں مسلمانوں کے ۵۷ ووٹ ہیں' لیکن مسلمانوں کو کوئی نہیں پوچھتا کہ آخر وہ کس کھیت کی مولی ہیں؟ عددی برتری کے باوجود عالمی برادری پر عالمِ اسلام کا کوئی دباؤ نہیں ہے۔

ادارۂ خلافت کے خاتمے کا دوسرا بڑا نقصان یہ ہوا کہ اسلام کے نظریۂ ملت کو ناقابلِ تلافی زک پہنچی اور اس کے مقابلے میں مغرب کے نظریۂ قومیت (Nationalism) کو پذیرائی ملی۔ اس لیے نہیں کہ یہ نظریہ درست تھا' بلکہ اس لیے کہ اسلام کے نظریۂ ملت کا دفاع کرنے والے کمزور ہو گئے تھے۔ یورپ میں نیشنل ازم کا نظریہ انیسویں صدی تک پورے طور پر پھیل چکا تھا۔ مسلمان نوجوان' جو حصولِ علم کے لیے یورپ کے ممالک جاتے تھے' ان نظریات سے متاثر ہو رہے تھے۔ ۱۹۱۶ء کی عرب بغاوت اسی کا نتیجہ تھی۔ خلافت کے خاتمے کے بعد تو سارے ہی مسلمان ملکوں کا رجحان' پہلے سے زیادہ شدت سے' قومیت کی طرف بڑھنے لگا اور مسلمانوں کی عالمی سیاسی وحدت کا تصور دھندلاتا چلا گیا۔ اور اب صورتحال یہ ہے کہ ہر مسلم ملک' چاہے اس

کی آبادی چند لاکھ ہی کیوں نہ ہو' ایک مستقل قومیت کا حامل اور ایک مستقل حکومت کا علمبردار بنا ہوا ہے' جس کے نتیجے میں وہ اہلِ اسلام جنہیں ایک نظامِ خلافت کے جھنڈے تلے اکٹھے رہنا چاہیے تھا' بے شمار ٹکڑوں میں بٹ کر رہ گئے اور قریب قریب ہر ٹکڑا بے وزن ہو رہا۔ ان چھوٹے بڑے' کٹے پھٹے' بے وزن ٹکڑوں کو دیکھ کر بادیٔ النظر میں یہ اندازہ لگانا دشوار ہے کہ جب یہ ایک ادارۂ خلافت کے تحت متحد تھے تو ایک زبردست عالمی طاقت تھے۔ اس سے زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ عالمِ اسلام اب بھی اپنی خستہ حالی پر نظر ڈالنے کو تیار نہیں۔ ؎

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا

کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا!

آج مسلمان اتنا بھی سمجھنے کے لیے تیار نہیں کہ بے وزنی اور جرمِ ضعیفی کی سزا ذلّت اور سرافگنی کے سوا اور کچھ نہیں ہوا کرتی۔

پس چہ باید کرد:

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اب کیا کیا جائے؟

اوّلاً—— کرنے کا سب سے بنیادی کام یہ ہے کہ مسلمانوں میں اس شعور کو اُجاگر کیا جائے کہ نظامِ خلافت کا احیاء بہت ضروری ہے' کیونکہ یہ شارع کا حکم ہے۔ خلافت کی کرسی تین دن سے زیادہ خالی نہیں رکھی گئی۔ جہاں دو مسلمان ہوتے ہیں وہاں بھی شارع کا حکم ہے کہ ایک امیر بنایا جائے تو جہاں ڈیڑھ ملین مسلمان ہیں وہ کسی امیر سے بے نیاز کیسے ہو سکتے ہیں؟ اس پر فقہاء کا اجماع ہے کہ امامِ عادل کے بغیر مسلمانوں کی کوئی ملی اور اجتماعی زندگی نہیں ہو سکتی۔ یہ ایک امر خراب ہونے سے مسلمانوں کے تمام معاملات تہس نہس ہو جائیں گے' جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے پیش گوئی فرما دی تھی:

((لَيُنْقَضَنَّ عُرَى الْإِسْلَامِ عُرْوَةً عُرْوَةً' فَكُلَّمَا انْتَقَضَتْ عُرْوَةٌ تَشَبَّثَ النَّاسُ بِالَّتِيْ تَلِيهَا' وَاَوَّلُهُنَّ نَقْضًا الْحُكْمُ وَ آخِرُهُنَّ الصَّلَاةُ))(۱۲)

''اسلام کی گرہیں ایک کے بعد ایک کھلیں گی۔ جب ایک گرہ کھلے گی تو لوگ اگلی گرہ کو پکڑ لیں گے۔ سب سے پہلی گرہ جو کھلے گی وہ اسلام کی حکمرانی کی گرہ ہو گی اور آخری گرہ جو کھلے گی وہ نماز کی ہو گی۔''

ثانیاً—— عہدِ حاضر کی فکری پراگندگی دور کرنے کی شدید ضرورت ہے۔ مغرب سے

آنے والا ہر فکر مسلمانوں کے لیے قابل قبول نہیں ہوسکتا۔ مغربی افکار کے پیچھے ان کا اپنا قومی ماضی اور ان کے اپنے تجربات ہوتے ہیں جو ضروری نہیں کہ مسلمانوں کے ماضی اور ان کے تجربات جیسے ہی ہوں۔ مسلمانوں کو مذہب کا وہ تلخ تجربہ نہیں ہے جو مغرب کو چرچ سے پہنچا تھا۔ لہٰذا مغرب اگر لادینیت (Secularism) کی طرف مڑ گیا تو حیرت انگیز بات نہیں' لیکن مسلمان اپنا انسانیت نواز اور حیات آفرین دین چھوڑ کر لادینیت کی طرف کیوں نکلے گا؟ اسی طرح دوسرے مغربی افکار ہیں' مثلاً جمہوریت اور وطنیت وغیرہ۔ یہ نظریات اسلام کی بنیادی تعلیمات کے یکسر خلاف ہیں۔

ثالثاً—— اسلامی نظامِ حکومت (خلافت) کے قیام کے لیے دامے' درمے' قدمے' سخنے کوشش کی جائے۔ ہمارا کام کوشش کرنا ہے' نتائج اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں۔ اس کوشش کی وجہ سے کم از کم ''جاہلیت کی موت'' سے بچ سکیں گے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ مَاتَ وَلَيْسَ فِيْ عُنُقِهٖ بَيْعَةٌ مَاتَ مِيْتَةً جَاهِلِيَّةً))(۱۳)

''جو کوئی ایسی حالت میں مرا کہ اس کی گردن میں (خلیفہ کی) بیعت (کا طوق) نہ ہو تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔''

المختصر اسلامی نظامِ سیاست و حکومت (خلافت) ایک منفرد اور مکمل نظام ہے جو اشتراکیت اور جمہوریت دونوں کی ضد ہے۔ اسلام میں جمہوریت یا اشتراکیت کا پیوند لگانا اسلامی نظامِ حکومت کو ناقص قرار دینے کے مترادف ہے۔

مسلمانوں کو جلد یا بدیر اپنے ہی نظامِ سیاست و حکمرانی (یعنی خلافت) کے قیام کے لیے کوششیں کرنی ہوں گی تاکہ دیگر تمام نظام ہائے حیات مثلاً معاشرت' معیشت' عدل و احتساب' دفاعی و خارجہ امور' اور تعلیمی معاملات میں انقلاب آفرین مثبت تبدیلیاں لائی جاسکیں۔ خلافت کا قیام فرض ہے (الخلافة أمّ الفرائض)۔ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اپنی کتاب ''سیاستِ شرعیہ'' میں کہتے ہیں:

''یہ جاننا فرض ہے کہ لوگوں پر حکمرانی کرنے کا ادارہ دین کے سب سے بڑے فرائض میں سے ہے۔ یہاں تک کہ دین اس کے بغیر قائم ہی نہیں ہوسکتا۔''

تمام ائمہ اس بات پر متفق ہیں کہ امامت فرض ہے اور مسلمانوں پر یہ فرض ہے کہ وہ ایک امام کا انعقاد کریں جو احکامِ دین نافذ کرے اور مظلوموں کو ان کا حق دلائے۔ صحیح مسلم کی

حدیث ہے:

((اِنَّمَا الْاِمَامُ جُنَّةٌ يُقَاتَلُ مِنْ وَرَائِهٖ وَيُتَّقٰى بِهٖ))(۱۴)

''خلیفہ ڈھال ہے جس کے پیچھے رہ کر لڑا جاتا ہے اور اسی کے ذریعہ تحفظ حاصل ہوتا ہے۔''

آج یہ ڈھال ٹوٹ چکی ہے۔ لہٰذا مسلمانوں پر دشمنوں کی چوطرفہ یلغار ہے اور مسلمان جتنا بے بس آج ہے کبھی نہیں تھا۔ لیکن اُمید کی کرن رسول اللہ ﷺ کی وہ تفصیلی حدیث ہے جو مسند امام احمد میں موجود ہے اور جس میں رسول اللہ ﷺ نے پیش گوئی فرمائی کہ:

((..... ثُمَّ تَكُوْنُ خِلَافَةً عَلٰى مِنْهَاجِ النُّبُوَّةِ))

یعنی پھر بالآخر نبوت کے طریقے پر خلافت قائم ہوگی! ان شاء اللہ العزیز !!

حوالہ جات

(۱) نعمانی' محمد عبدالرشید' لغات القرآن' (ندوۃ المصنفین) ۱۹۴۵ء' جلد ۲' ص ۸۔۳۱۷۔

(۲) قرآن میں لفظ ''خلیفہ'' دو جگہ آیا ہے۔ ایک سورۃ البقرۃ آیت ۳۰ میں ﴿وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً﴾ ''اور جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں''۔ دوسرے سورۂ صٓ' آیت ۲۶ میں ﴿يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ﴾ ''اے داؤد' ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے' پس تم لوگوں کے مابین حق کے ساتھ فیصلے کرو اور اپنی خواہش کی پیروی نہ کرو' یہ تم کو اللہ کی راہ سے گمراہ کردے گی۔ بلاشبہ وہ لوگ جو اللہ کی راہ سے گمراہ ہو جاتے ہیں ان کے لیے شدید عذاب ہے' کیونکہ یہ لوگ حساب کے دن کو بھلا بیٹھے ہیں۔''

(۳) مثلاً: الانعام: ۱۶۵' الاعراف: ۶۹ و ۷۴' یونس: ۱۴' ھود: ۵۷' النور: ۵۵۔

(۴) قرآن کہتا ہے: ﴿اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ﴾ (الحج: ۴۱) ''وہ لوگ کہ اگر ہم ان کی طاقت زمین میں جما دیں تو ان کا کام یہ ہوگا کہ نماز کو قائم کریں گے' زکوٰۃ ادا کریں گے' نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے دنیا کو روکیں گے۔''

(۵) خلافت کے خاتمے کے پیچھے صیہونی عزائم اب ڈھکی چھپی بات نہیں۔اس مقصد کے حصول میں ترکی نژاد یہودی' جو دونمہ کہلاتے ہیں اور مشرقی یورپ کے یہودی' جو اشکنیازم کہلاتے ہیں' نے نہایت اہم رول ادا کیا۔ترکی کے مصطفٰے کمال پاشا' بدنامِ زمانہ یہودی تحریک فری میسن لاج کے سرگرم رکن تھے۔اس کے علاوہ ایران کے آخری بادشاہ رضا شاہ پہلوی' مصر کے صدر انورالسادات اور ایران کے وزیراعظم امیر عباس ہویدا کے بارے میں متعین طور پر معلوم ہے کہ وہ فری میسن تحریک کے سرگرم کارکن تھے۔(دیکھئے اسرار عالم کی کتاب ''بین الاقوامی ایجنسیاں'' ادارۂ معارف اسلامی' کراچی' ص ۲۵)۔

(۶) Zalloom, Abdul Qadeem, 'How the Khilafah was destroyed' (Lahore, 1924) P. 186-

(۷) پوری بحث کے لیے دیکھئے: مسئلہ خلافت' از مولانا ابوالکلام آزاد' ص ۴۰ و بعد (مکتبۂ جمال' لاہور ۲۰۰۹ء)۔

(۸) برنی' ضیاءالدین احمد' حیات مولانا محمد علی جوہر' (اردو اکیڈمی' سندھ کراچی' ۲۰۰۱ء) ص ۱۱۹۔

(۹) عمران این حسین ''استنبول سے رباط تک'' (مکتبہ خدام القرآن' لاہور' ۲۰۰۹ء) ص ۱۷۔

(۱۰) کانگریس کے شرکاء میں مصر' لیبیا' تیونس' مراکش' جنوبی افریقہ' انڈونیشیا' یمن' حجاز' فلسطین' عراق وغیرہ شامل تھے۔تاہم ترکی' ایران' افغانستان' کے علاوہ روس' چین اور ہندوستان کے مسلمانوں کے وفود شریک نہیں ہوئے۔

(۱۱) مریم جمیلہ 'Islam and Modernism' (لاہور' ۱۹۶۸ء) ص ۱۴۹۔

(۱۲) مسند احمد' ح:۲۱۱۳۹۔

(۱۳) صحیح مسلم' کتاب الامارۃ' باب وجوب ملازمة جماعة المسلمين عند ظهور الفتن.....

(۱۴) صحیح البخاری' کتاب الجهاد والسیر' باب یقاتل من وراء الامام ویتقی به۔ وصحیح مسلم' کتاب الامارۃ' باب الامام جنة یقاتل من ورائه ویتقی به۔

❁❁❁

میثاق' حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجیے۔

السَّلامُ علیکُم ورحمۃُ اللّٰہ وبرکاتُہ

فضائل وآداب

حافظ محمد زاہد☆

دُنیا کی تمام تہذیبوں اور قوموں میں ایسے دعائیہ کلمات رائج ہیں جو معاشرے کے افراد باہمی ملاقات کے وقت پیار محبت اور خیر اندیشی کے اظہار کے لیے استعمال کرتے ہیں' مثلاً مغربی ممالک میں ''گُڈ مارننگ'' اور ''گُڈ ایوننگ'' جیسے الفاظ استعمال ہوتے ہیں' ہندوؤں میں ''نمستے'' جبکہ سکھوں میں ''ست سری اکال'' کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ ایسے دعائیہ کلمات دور جاہلیت کے عرب معاشرے میں بھی رائج تھے جن کا تذکرہ ہمیں سنن ابی داؤد کی ایک روایت میں ملتا ہے۔

''عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم دورِ جاہلیت میں (ملاقات کے وقت) کہتے تھے: اَنْعَمَ اللّٰہُ بِکَ عَیْنًا (اللہ تمہاری آنکھوں کو ٹھنڈا کرے) اور اَنْعِمْ صَبَاحًا (تمہاری صبح خوشگوار ہو)۔ اور پھر جب اسلام آیا تو ہمیں اس سے روک دیا گیا۔''(۱)

اسلام نے بھی ملاقات کے وقت دعائیہ کلمات کہنے کا یہ سلسلہ جاری رکھا' بس فرق یہ کیا کہ دورِ جاہلیت کے کلمات کو ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'' سے بدل دیا گیا۔ یہ بہترین اور نہایت جامع دعائیہ کلمات ہیں جن کے معنی ہیں: ''آپ کو دُنیا و آخرت کی سلامتی نصیب ہو اور اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں آپ پر نازل ہوں''۔ اس دعائیہ کلمات میں اپنے سے چھوٹوں کے لیے شفقت بھی ہے اور بڑوں کے لیے اکرام و تعظیم بھی۔

شرعی نقطہ نظر سے سلام کہنا سنت ہے جبکہ اس کا جواب دینا واجب ہے۔ سورۃ النساء میں ہمیں سلام کے بارے میں یہ ہدایت ملتی ہے کہ سلام کے جواب میں کچھ اضافہ کریں یا کم از کم انہی الفاظ سے سلام کا جواب دیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

☆ادارتی معاون' شعبہ مطبوعات' قرآن اکیڈمی' لاہور۔ pmzahids@yahoo.com

﴿وَاِذَا حُیِّیْتُمْ بِتَحِیَّۃٍ فَحَیُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْھَآ اَوْ رُدُّوْھَا ۭ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ حَسِیْبًا ﴿۸۶﴾﴾

''اور جب تمہیں سلامتی کی کوئی دعا دی جائے تو تم بھی سلامتی کی اس سے بہتر دعا دو یا اسی کو لوٹا دو۔ یقیناً اللہ ہر چیز کا حساب رکھنے والا ہے۔''

مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ سلام کی اہمیت اور فضیلت کو بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''کسی مسلمان کو سلام کرنا یا دعا دینا درحقیقت اللہ سے اس کی شفاعت کرنا ہے۔''(۲)

سلام کی اہمیت اور فضائل

سلام کی اہمیت اور فضائل کے بارے میں احادیث کا ایک ذخیرہ موجود ہے' جس میں سے چند ایک یہاں بیان کی جا رہی ہیں۔

سلام' قربِ الٰہی اور جنت کا ذریعہ

سلام کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بآسانی لگایا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام میں پہل کرنے کو اللہ تعالیٰ کی قربت اور جنت کا ذریعہ قرار دیا' جبکہ ہم ہیں کہ اتنے قیمتی عمل میں بلاوجہ سستی کرتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اِنَّ اَوْلَی النَّاسِ بِاللّٰہِ مَنْ بَدَأَھُمْ بِالسَّلَامِ))(۳)

''لوگوں میں اللہ کے قریب (اور اس کی رحمت کا زیادہ مستحق) وہ ہوگا جو سلام کرنے میں پہل کرے۔''

ایک دوسری حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین چیزوں کو جنت کا ذریعہ قرار دیا' جن میں سے ایک سلام کرنا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اُعْبُدُوا الرَّحْمٰنَ' وَاَطْعِمُوا الطَّعَامَ' وَاَفْشُوا السَّلَامَ تَدْخُلُوا الْجَنَّۃَ بِسَلَامٍ))(۴)

''رحمٰن کی عبادت کرو' (بندگانِ خدا کو) کھانا کھلاؤ اور سلام کو پھیلاؤ' جنت میں پہنچ جاؤ گے سلامتی کے ساتھ۔''

سلام' نیکی کمانے کا آسان ترین ذریعہ

ایک حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کا طریقہ بیان کیا اور یہ بھی بتایا کہ اس پر کتنی

نیکیاں ملتی ہیں۔عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

جَاءَ رَجُلٌ اِلَی النَّبِیِّ ﷺ فَقَالَ السَّلَامُ عَلَیْکُمْ، فَرَدَّ عَلَیْهِ السَّلَامَ، ثُمَّ جَلَسَ، فَقَالَ النَّبِیُّ ﷺ ((عَشْرٌ))، ثُمَّ جَاءَ رَجُلٌ آخَرُ فَقَالَ السَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ، فَرَدَّ عَلَیْهِ، فَجَلَسَ، فَقَالَ((عِشْرُوْنَ))، ثُمَّ جَاءَ آخَرُ فَقَالَ السَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَکَاتُهٗ، فَرَدَّ عَلَیْهِ، فَجَلَسَ، فَقَالَ (ثَلَاثُوْنَ))(۵)

''ایک آدمی نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور اس نے کہا: السلام علیکم! آپؐ نے اس کو جواب دیا اور وہ بیٹھ گیا۔آپؐ نے فرمایا: ''اس کے لیے دس (نیکیاں) ہیں''۔پھر دوسرا شخص آیا اور اس نے کہا: السلام علیکم ورحمۃ اللہ! آپؐ نے اس کو جواب دیا تو وہ بیٹھ گیا۔آپؐ نے فرمایا: ''اس کے لیے بیس (نیکیاں) ہیں''۔پھر ایک اور شخص آیا اور اس نے کہا: السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! آپؐ نے اس کو جواب دیا تو وہ بیٹھ گیا۔آپؐ نے فرمایا: ''اس کے لیے تیس (نیکیاں) ہیں۔''

سلام نیکی کمانے کا ایسا آسان ذریعہ ہے جس کے لیے کوئی محنت نہیں کرنی پڑتی، بس زبان سے دو بول بولنے پڑتے ہیں۔آج ہمیں ان نیکیوں کی قدر نہیں ہے۔ان نیکیوں کی قدر ہمیں قیامت کے روز ہوگی جب ایک نیکی کی کمی یا زیادتی سے انسان کے جنتی یا جہنمی ہونے کا فیصلہ ہوگا۔

سلام، باہمی محبت کا باعث

ملاقات کے وقت سلام کرنے سے باہمی محبت میں اضافہ ہوتا ہے اور معاشرے میں اخوت کو فروغ ملتا ہے۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَاتَدْخُلُوا الْجَنَّةَ حَتّٰی تُؤْمِنُوْا، وَلَا تُؤْمِنُوْا حَتّٰی تَحَابُّوْا، أَوَلَا أَدُلُّکُمْ عَلٰی شَیْءٍ اِذَا فَعَلْتُمُوْهُ تَحَابَبْتُمْ :أَفْشُوا السَّلَامَ بَیْنَکُمْ))(۶)

''تم جنت میں داخل نہیں ہو سکتے یہاں تک کہ تم کامل مؤمن بن جاؤ، اور تم کامل مؤمن نہیں بن سکتے جب تک کہ تم ایک دوسرے سے محبت نہ کرو۔کیا میں تمہیں ایسا کام نہ بتاؤں کہ جب تم اسے کرو تو تم آپس میں محبت کرنے لگو۔(وہ کام یہ ہے کہ) آپس میں سلام کو عام کرو۔''

سلام، ایک پسندیدہ عمل

سلام کرنے سے معاشرے میں باہمی محبت والفت اور خیر اندیشی کو فروغ ملتا ہے، اس

لیے نبی کریم ﷺ نے اسے اسلام کا پسندیدہ عمل قرار دیا ہے۔حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ کون سا اسلام (یعنی اسلام کا کون سا عمل) پسندیدہ ہے؟ آپؐ نے فرمایا:

((تُطْعِمُ الطَّعَامَ وَتَقْرَأُ السَّلَامَ عَلٰی مَنْ عَرَفْتَ وَمَنْ لَمْ تَعْرِفْ))(۷)

''(ایک) یہ کہ تم (بندگانِ خدا کو) کھانا کھلاؤ اور (دوسرے) یہ کہ جس کے ساتھ جان پہچان ہو اس کو بھی اور جس کے ساتھ جان پہچان نہ ہو اس کو بھی سلام کرو۔''

سلام، مسلمان کا حق

ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر کئی حقوق ہیں، جن کا ادا کرنا ضروری ہے۔ان حقوق میں سے ایک حق سلام کرنا بھی ہے۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((حَقُّ الْمُسْلِمِ عَلَی الْمُسْلِمِ سِتٌّ)): قِیْلَ مَاهُنَّ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ: ((اِذَا لَقِیْتَهٗ فَسَلِّمْ عَلَیْهِ، وَاِذَا دَعَاکَ فَأَجِبْهُ، وَاِذَا اسْتَنْصَحَکَ فَانْصَحْ لَهٗ، وَاِذَا عَطَسَ فَحَمِدَ اللّٰهَ فَشَمِّتْهُ، وَاِذَا مَرِضَ فَعُدْهُ، وَاِذَا مَاتَ فَاتَّبِعْهُ))(۸)

''مسلمان کے مسلمان پر چھ حقوق ہیں''۔صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا: یا رسول اللہ! کون کون سے؟ آپؐ نے فرمایا: ''(۱) جب تو اس سے ملے تو اسے سلام کرے۔(۲) جب وہ مدعو کرے تو اس کی دعوت قبول کرے۔(۳) جب وہ نصیحت (یا مخلصانہ مشورہ) کا طالب ہو تو اس کی خیر خواہی کرے۔(۴) جب اس کو چھینک آئے اور وہ الحمدللہ کہے تو اس کا جواب (یرحمک اللہ کے ساتھ) دے۔(۵) جب وہ بیمار ہو تو اس کی عیادت کرے۔(۶) جب وہ انتقال کر جائے تو اس کے (جنازے کے) ساتھ جائے۔''

سلام، تکبّر کا علاج

کبریائی اللہ تعالیٰ کی چادر ہے اور اللہ کو یہ گوارا نہیں کہ کوئی اور اس چادر پر اپنا حق جتائے اور خود غرور و تکبر میں مبتلا ہو جائے۔اللہ کے رسول ﷺ نے سلام میں پہل کرنے والے کو تکبر سے بری قرار دیا ہے، فرمایا:

((اَلْبَادِئُ بِالسَّلَامِ بَرِیْءٌ مِنَ الْکِبْرِ))(۹)

''سلام میں پہل کرنے والا تکبّر سے بری ہے۔''

سلام سے اہلِ جنت کا استقبال

سلام کی اہمیت اور فضیلت کا اس بات سے بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ فرشتے اور اللہ جل شانہ کی ذات مبارکہ خود اہلِ جنت کا سلام کے ساتھ استقبال کریں گے۔

﴿تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهٗ سَلٰمٌ ۚ﴾ (الاحزاب:٤٤)

''دعا ان کی جس دن اس سے ملیں گے سلام ہے۔''

مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''یعنی اللہ ان پر سلام بھیجے گا اور فرشتے سلام کرتے ہوئے ان کے پاس آئیں گے۔ اور مؤمنین کی آپس میں بھی یہ ہی دعا ہوگی جیسا کہ دنیا میں ہے۔''

مولانا مودودی رحمہ اللہ نے فرمایا:

''اس کے تین مطلب ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ خود السلام علیکم کے ساتھ ان کا استقبال فرمائے گا..... دوسرے یہ کہ ملائکہ ان کو سلام کریں گے..... تیسرے یہ کہ وہ خود آپس میں ایک دوسرے کو سلام کریں گے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ جنت میں بھی مؤمنین ایک دوسرے کو ملاقات کے وقت سلام کریں گے جیسا کہ دنیا میں وہ ایک دوسرے کو سلام کرتے تھے۔ اس کا ذکر سورۂ یونس میں واضح الفاظ میں ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ۚ﴾ (یونس:١٠)

''ان کی پکار ہوگی اس میں ''اے اللہ تو پاک ہے'' اور ان کی دعا ہوگی اس میں ''سلام'' (یعنی سلامتی ہو)۔''

سلام کے آداب وضوابط

سلام اور جوابِ سلام کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے کچھ آداب اور ضوابط بھی تعلیم فرمائے ہیں جن کو مختصراً بیان کیا جا رہا ہے:

چھوٹے بڑوں کو اور گزرنے والے بیٹھوں کو سلام کریں!

رسول اللہ ﷺ نے سلام کے بارے میں یہ ہدایت فرمائی کہ چھوٹا بڑے کو، گزرنے والا بیٹھے کو اور تھوڑے لوگ زیادہ کو سلام کریں، فرمایا:

((يُسَلِّمُ الصَّغِيْرُ عَلَى الْكَبِيْرِ، وَالْمَارُّ عَلَى الْقَاعِدِ، وَالْقَلِيْلُ عَلَى الْكَثِيْرِ))(١٠)

''چھوٹا بڑے کو، (راستے سے) گزرنے والا بیٹھے ہوؤں کو اور تھوڑے آدمی زیادہ لوگوں کو سلام کیا کریں۔''

☆ ادب کا تقاضا تو یہی ہے کہ چھوٹے بڑوں کو سلام کریں، لیکن کبھی بڑوں کو بھی شفقت کرتے ہوئے سلام میں پہل کرنی چاہیے۔ اس سے نہ تو ان کی کوئی توہین ہوتی ہے اور نہ یہ شریعت کے خلاف ہے، اس لیے کہ یہ رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ مَرَّ عَلٰى غِلْمَانٍ فَسَلَّمَ عَلَيْهِمْ(١١)

''رسول اللہ ﷺ ایک دفعہ بچوں کے پاس سے گزرے تو آپؐ نے انہیں سلام کیا۔''

☆ اسی طرح کبھی بیٹھے ہوئے کو بھی چاہیے کہ وہ آنے والے کا استقبال اور اس کی عزت افزائی کرنے کے لیے خود سلام کرے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ﴾ (الانعام:٥٤)

''اور جب تمہارے پاس ایسے لوگ آئیں جو ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں تو (ان سے) ''السلام علیکم'' (یعنی تم پر سلامتی ہو) کہا کرو۔''

جماعت میں سے ایک شخص کا سلام و جواب کافی

سلام کے بارے میں یہ بھی ہدایت ملتی ہے کہ جماعت میں سے ایک شخص کا سلام اور جوابِ سلام سب کی طرف سے کفایت کر جائے گا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کی طرف نسبت کر کے فرمایا:

((يُجْزِئُ عَنِ الْجَمَاعَةِ اِذَا مَرُّوْا اَنْ يُّسَلِّمَ اَحَدُهُمْ وَيُجْزِئُ عَنِ الْجُلُوْسِ اَنْ يَّرُدَّ اَحَدُهُمْ)) (١٢)

''گزرنے والی جماعت میں سے اگر ایک آدمی سلام کر لے تو پوری جماعت کی طرف سے کافی ہو جائے گا، اور بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے اگر ایک جواب دے دے تو سب کی طرف سے کافی ہو جائے گا۔''

گھر والوں کو سلام کرنا

بعض لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ جب باہر کسی سے ملتے ہیں تو اسے فوراً سلام کرتے ہیں' لیکن جب گھر جاتے ہیں تو گھر والوں کو سلام نہیں کرتے' حالانکہ سلام کا مطلب اللہ تعالیٰ سے کسی کے حق میں سلامتی کی دعا کرنا ہے' جبکہ گھر والوں کے لیے سلامتی کی دعا کرنا تو اولیٰ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُيُوْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ تَحِيَّةً مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُبٰرَكَةً طَيِّبَةً ؕ﴾ (النور:٦١)

''پس جب تم داخل ہو گھروں میں تو سلام کرو اپنے (گھر والوں) پر' یہ برکت والی پاکیزہ دعا ہے اللہ کی طرف سے۔''

یہاں ترغیب کے لیے گھر والوں کو سلام کرنے کو اللہ کی طرف سے پاکیزہ دعا کہا گیا ہے۔ اسی طرح حدیث میں بھی گھر والوں کو سلام کرنے کا حکم موجود ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو فرمایا:

((يَا بُنَيَّ! اِذَا دَخَلْتَ عَلٰى اَهْلِكَ فَسَلِّمْ يَكُنْ بَرَكَةً عَلَيْكَ وَعَلٰى اَهْلِ بَيْتِكَ)) (١٣)

''اے میرے بیٹے! جب تو اپنے گھر میں داخل ہو تو سلام کر' یہ (سلام کرنا) تیرے لیے اور تیرے گھر والوں کے لیے باعثِ برکت ہے۔''

جاتے وقت سلامِ وداع کہنا

ہمارے معاشرے میں لوگ عموماً آتے وقت تو سلام کرتے ہیں لیکن جاتے وقت سلامِ وداع بہت کم لوگ کرتے ہیں' حالانکہ جس طرح پہلا سلام ضروری ہے اسی طرح جاتے وقت سلام کرنا بھی ضروری ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِذَا انْتَهٰى اَحَدُكُمْ اِلٰى مَجْلِسٍ فَلْيُسَلِّمْ' فَاِنْ بَدَالَهٗ اَنْ يَّجْلِسَ فَلْيَجْلِسْ' ثُمَّ اِذَا قَامَ فَلْيُسَلِّمْ' فَلَيْسَتِ الْاُوْلٰى بِاَحَقَّ مِنَ الْاٰخِرَةِ)) (١٤)

''جب تم میں سے کوئی مجلس میں آئے تو چاہیے کہ وہ (اہلِ مجلس کو) سلام کرے' پھر اگر بیٹھنا چاہے تو بیٹھ جائے' پھر جب جانے لگے تو پھر سلام کرے' کیونکہ پہلا سلام دوسرے سلام سے اعلیٰ نہیں ہے (یعنی دونوں سلام ایک ہی جیسے ضروری ہیں)۔''

غیر مسلم کو سلام میں پہل کرنے کی ممانعت

غیر مسلموں کو سلام کرنے میں پہل نہیں کرنی چاہیے' اس لیے کہ سلام میں پہل کرنے سے ان کے احترام اور اکرام کا شائبہ ہوتا ہے' جبکہ وہ کسی اکرام و تعظیم کے مستحق نہیں ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَا تَبْدَءُوا الْيَهُوْدَ وَ لَا النَّصَارٰى بِالسَّلَامِ' فَاِذَا لَقِيْتُمْ اَحَدَهُمْ فِيْ طَرِيْقٍ فَاضْطَرُّوْهُ اِلٰى اَضْيَقِهٖ)) (١٥)

''یہود و نصاریٰ کو سلام میں پہل نہ کیا کرو' اور جب تم ان سے راہ میں ملو تو ان کو ایک طرف سمٹنے پر مجبور کر دو۔''

غیر مسلم کو جواب دینے کا طریقہ

ایک طرف غیر مسلم کو سلام میں پہل کرنے کی ممانعت ہے تو دوسری طرف یہ ہدایت ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم سلام میں پہل کرے تو اس کا جواب ''وعلیکم'' کے ساتھ دینا چاہیے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

اَنَّ اَصْحَابَ النَّبِيِّ ﷺ قَالُوْا لِلنَّبِيِّ ﷺ : اِنَّ اَهْلَ الْكِتَابِ يُسَلِّمُوْنَ عَلَيْنَا فَكَيْفَ نَرُدُّ عَلَيْهِمْ؟ قَالَ: ((قُوْلُوْا وَعَلَيْكُمْ)) (١٦)

رسول اللہ ﷺ کے صحابہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اہلِ کتاب ہمیں سلام کرتے ہیں تو ہم کیسے جواب دیں؟ آپؐ نے فرمایا: ''کہو وعلیکم (یعنی اگر واقعتاً تم نے سلامتی کی دعا کی ہے تو تم پر بھی سلامتی ہو اور اگر موت کی بدعا کی ہے تو وہ تم پر ہی ہو)۔''

''جاہل'' کو سلام کے ساتھ اپنے سے دور کرنا

یہاں جاہل سے مراد اَن پڑھ یا بے علم نہیں بلکہ وہ شخص ہے جو جہالت پر اتر آئے اور بدتمیزی کا برتاؤ کرنے لگے۔ ایسے لوگوں سے کنارہ کش ہونے کے لیے بھی اسلام نے سلامتی کا راستہ اپنانے کی ہدایت کی ہے کہ ایسا رویہ اختیار کرنے والوں سے سلام کر کے الگ ہو جاؤ اور ان کے منہ نہ لگو۔ فرمایا:

﴿وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ﴿٦٣﴾﴾ (الفرقان)

''رحمٰن کے (اصل) بندے تو وہ ہیں جو زمین پر دبے پاؤں چلتے ہیں اور جب جاہل ان کے منہ آئیں تو کہہ دیتے ہیں کہ (تم کو) سلام۔''

سلام نہ کرنے کے مواقع

بعض مواقع ایسے ہیں جن میں سلام کرنا ممنوع ہے‘ اور اگر کوئی آدمی ناواقفی سے سلام کردے تو اس کا جواب نہیں دینا چاہیے:

① قضائے حاجت میں مشغول شخص کو سلام نہیں کرنا چاہیے اور نہ اسے جواب دینا چاہیے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے‘ وہ فرماتے ہیں:

اَنَّ رَجُلًا سَلَّمَ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ وَ هُوَيَبُوْلُ فَلَمْ يَرُدَّ عَلَيْهِ (۱۷)

”ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کو اس حالت میں سلام کیا جب آپؐ پیشاب کے لیے بیٹھے تھے‘ تو آپؐ نے اس کے سلام کا جواب نہیں دیا۔“

② ایسے مواقع پر بھی سلام کرنا ممنوع ہے جس میں لوگوں کے آرام میں خلل واقع ہو‘ مثلاً کسی سوئے ہوئے کو سلام نہیں کرنا چاہیے۔ حضرت مقداد بن الاسودؓ فرماتے ہیں:

فَيَجِيْئُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مِنَ اللَّيْلِ فَيُسَلِّمُ تَسْلِيْمًا لَا يُوْقِظُ النَّائِمَ وَ يُسْمِعُ الْيَقْظَانَ (۱۸)

”رسول اللہ ﷺ رات کو اصحابِ صُفّہ کے پاس تشریف لاتے تو آپ ﷺ اس طرح (آہستہ اور احتیاط سے) سلام کرتے کہ سونے والے نہ جاگتے اور جاگنے والے سن لیتے۔“

اس کے علاوہ بھی اور کئی مواقع ہیں جن کا تذکرہ مختلف کتابوں میں ملتا ہے‘ مثلاً مولانا محمد یوسف اصلاحی صاحب نے اپنی کتاب ”آدابِ زندگی“ میں ان مواقع کا ذکر کیا ہے جن میں سلام کرنا ممنوع ہے۔

③ جب لوگ قرآن وحدیث پڑھنے پڑھانے یا سننے میں مصروف ہوں۔

④ جب کوئی خطبہ دینے اور سننے میں مصروف ہو۔

⑤ جب کوئی اذان یا تکبیر کہہ رہا ہو۔

⑥ جب کسی مجلس میں کوئی دینی گفتگو ہو رہی ہو یا کوئی کسی کو دین کی بات سمجھا رہا ہو۔

⑦ جب استاد پڑھانے میں مصروف ہو۔

⑧ جب کوئی فسق وفجور اور خلافِ شرع لہو ولعب اور عیش وطرب میں مبتلا ہو کر دین کی توہین کر رہا ہو۔

⑨ جب کوئی گالی گلوچ‘ بے ہودہ بکواس‘ جھوٹی سچی غیر سنجیدہ باتیں اور فحش مذاق کر کے دین کو بدنام کر رہا ہو۔

⑩ جب کوئی خلافِ دین وشریعت افکار ونظریات کی تبلیغ کر رہا ہو اور لوگوں کو دین سے برگشتہ کرنے اور بدعت وبے دینی اختیار کرنے پر ابھار رہا ہو۔

⑪ جب کوئی دینی عقائد وشعائر کی بے حرمتی کر رہا ہو اور شریعت کے اصول واحکام کا مذاق اڑا کر اپنی خباثت اور منافقت کا اظہار کر رہا ہو۔

خلاصۂ کلام

آخر میں سلام کے بارے میں چند ان خرابیوں کا ذکر کرتے ہیں جو ہمارے معاشرے میں عام ہو چکی ہیں۔ مثلاً آج کل یہ دیکھا گیا ہے کہ لوگ السلام علیکم کا جواب بھی السلام علیکم کے ساتھ دیتے ہیں‘ حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ دونوں نے سلام کیا ہے اور جواب کسی نے نہیں دیا۔ ان دونوں میں سے جس نے پہلے سلام کیا ہے تو دوسرے کو چاہیے کہ اس کو جواب دے۔ اسی طرح ہمارے معاشرے میں یہ بھی عام ہے کہ بڑی حیثیت والے اپنے سے کم تر لوگوں کو سلام کرنے کو اپنی عزت کے خلاف سمجھتے ہیں‘ حالانکہ سلام میں پہل کرنے سے عزت کم نہیں بلکہ زیادہ ہوتی ہے۔ تیسری خرابی یہ ہے کہ لوگ سلام کرنے کے بجائے صرف ہاتھ یا سر کا اشارہ کر دیتے ہیں اور جواب میں بھی لوگ منہ سے کچھ نہیں بولتے بس اشارہ کر دیتے ہیں۔ یہ بھی صحیح نہیں ہے۔ البتہ اگر کوئی منہ سے سلام بھی کہے اور ہاتھ یا سر سے اشارہ بھی کرے تو یہ جائز ہے۔

آخر میں اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ ہمیں بھی سلام میں پہل کرنے‘ سلام کا جواب دینے اور سلام کے باقی ماندہ احکام پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یا ربّ العالمین!

حواشی

(۱) سنن ابی داوٗد‘ کتاب الادب‘ باب فی الرجل یقول انعم اللّٰہ بك عینا۔

(۲) تفسیر عثمانی‘ تفسیر سورۃ النساء‘ آیت ۸٦۔

(۳) سنن ابی داوٗد‘ کتاب الادب‘ باب فی فضل من بدأ بالسلام۔

(٤) سنن الترمذی‘ کتاب الاطعمة عن رسول اللّٰہ ﷺ‘ باب ماجاء فی فضل اطعام الطعام۔

(٥) سنن ابی داوٗد‘ کتاب الادب‘ باب کیف السلام۔

(٦) صحیح مسلم‘ کتاب الایمان‘ باب بیان انه لایدخل الجنة الا المؤمنون ......۔ وسنن الترمذی‘ کتاب الاستئذان والادب عن رسول اللّٰہ ﷺ‘ باب ما جاء فی افشاء السلام۔

(۷) صحیح البخاری‘کتاب الایمان‘ باب ما جاء فی افشاء السلام۔وصحیح مسلم‘کتاب الایمان‘باب بیان تفاضل الاسلام وای اموره افضل۔

(۸) صحیح مسلم‘کتاب السلام‘باب حق المسلم للمسلم رد السلام۔

(۹) رواه البیهقی فی شعب الایمان‘راوی:عبد اللّٰہبن مسعودؓ‘ **بحوالہ معارف الحدیث۔**

(۱۰) صحیح البخاری‘کتاب الاستئذان‘ باب تسلیم القلیل علی الکثیر۔

(۱۱) صحیح مسلم‘کتاب السلام‘باب استحباب السلام علی الصبیان۔

(۱۲) رواه البیهقی فی شعب الایمان‘راوی:علی بن طالبؓ‘ **بحوالہ معارف الحدیث۔**

(۱۳) سنن الترمذی‘کتاب الاستئذان والادب عن رسول اللّٰہ ﷺ‘ باب ما جاء فی التسلیم اذا دخل بیته۔

(۱٤) سنن الترمذی‘کتاب الاستئذان والادب عن رسول اللّٰہ ﷺ‘ باب ما جاء فی التسلیم عند القیام و عند القعود۔

(۱۵) صحیح مسلم‘کتاب السلام‘باب النهی عن ابتداء اهل الکتاب بالسلام وکیف یرد۔

(۱٦) سنن ابی داؤد‘کتاب الادب‘باب فی السلام علی اهل الذمة۔

(۱۷) سنن الترمذی‘کتاب الاستئذان والادب عن رسول اللّٰہ ﷺ‘ باب ما جاء فی کراهیة التسلیم علی من یبول۔

(۱۸) سنن الترمذی‘کتاب الاستئذان والادب عن رسول اللّٰہ ﷺ‘ باب کیف السلام۔

❁❁❁

: بیانُ القُ آن

البتہ اگر آپ کے ملک میں دین غالب ہو چکا ہے‘نظامِ خلافت قائم ہو چکا ہے‘اسلامی فلاحی ریاست وجود میں آ چکی ہے تو دین کی مزید نشر واشاعت‘ دعوت وتبلیغ اور نظامِ خلافت کی توسیع‘ عوامی فلاح و بہبود کی نگرانی‘امن وامان کا قیام‘ ملکی سرحدوں کی حفاظت‘ یہ سب حکومت اور ریاست کی ذمہ داریاں ہیں۔ایسی اسلامی ریاست میں ایک فرد کی ذمہ داری صرف اسی حد تک ہے جس حد تک حکومت کی طرف سے اسے مکلّف کیا جائے۔وہ کسی ٹیکس کی صورت میں ہو یا پھر کسی اور نوعیت کی ذمّہ داری ہو۔لیکن ایسی صورتِ حال میں ایک فرد‘ایک عام شہری آزاد ہے کہ وہ دین کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنی ذاتی زندگی اپنی مرضی سے گزارے۔اچھا کمائے‘اپنے بچوں کے لیے بہتر معیارِ زندگی اپنائے‘ دُنیوی ترقی کے لیے محنت کرے‘ علمی وتحقیقی میدان میں اپنی صلاحیتوں کو آزمائے یا روحانی ترقی کے لیے مجاہدہ کرے‘تمام راستے اس کے لیے کھلے ہیں۔

❁❁❁

کتابُ اللہ — معجز نما کلام

عتیق الرحمٰن صدیقی ☆

قرآن حکیم کی مختلف آیات پر اگر غور کیا جائے تو اس سے کتاب مبین کے متعدّد دریچے وا ہوتے ہیں اور اس کی عظمت و اعجاز کے بے شمار گوشوں سے قاری متعارف ہوتا ہے۔ قرآن کریم کا یہ اعجاز ہی کیا کم ہے کہ اس کا علم قطعی اور یقینی ہے۔ سورۃ البقرۃ کا آغاز ہی اس حقیقت کو مبرہن کرتا ہے: ﴿الٓمّٓ ۝۱ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ﴾ ''الف لام میم۔ یہ (اللہ کی) کتاب ہے اس میں کوئی شک نہیں''۔ اور سورۂ یونس میں فرمایا: ﴿وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۳۷﴾ ''احکامِ ضروریہ کی تفصیل بیان کرنے والا ہے' اس میں کوئی بات شک کی نہیں' تمام جہانوں کے پروردگار کی طرف سے ہے۔''

قرآن کا سرچشمہ علمِ الٰہی ہے

یہ ایک ایسی خصوصیت ہے کہ کوئی انسانی کتاب قرآن کے ساتھ شریک ہے نہ مماثل' اس لیے کہ الکتاب ہونے کی حیثیت سے اس کا ماخذ' مصدر' منبع اور سرچشمہ علمِ الٰہی ہے اور اس کا نزول وحیٔ الٰہی کے ذریعہ ہوا: ﴿وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۱۹۲ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ۝۱۹۳﴾ (الشعراء) ''بے شک یہ ربّ العالمین کا اُتارا ہوا ہے (اور) ایک معتبر فرشتہ اسے لے کر اُترا ہے''۔ یہ سرچشمہ ہر قسم کے تعارض' اشتباہ' نقائص' عیوب اور اختلاف سے پاک ہے اور ہر اعتبار سے محفوظ و مصئون بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ علیم و خبیر ہے اور تمام احوال کا احاطہ کیے ہوئے ہے: ﴿اِنَّمَآ اِلٰهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ۝۹۸﴾ (طٰہٰ) ''تمہارا معبود تو وہی اللہ ہے جس کے سوا کسی کی بندگی نہیں۔ سب چیز سما گئی ہے اس کے علم میں''۔ اس کے ہاں غلطی و نسیان کا نہ کوئی گزر ہے اور نہ احتمال: ﴿قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ ۚ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى ۝۵۲﴾ (طٰہٰ) ''کہا ان کی خبر میرے رب کے پاس لکھی ہوئی ہے' نہ بھٹکتا

☆ پرنسپل ریٹائرڈ' ہری پور

ہے میرا ربّ اور نہ بھولتا ہے''۔ وہ اللہ ہر چیز کا خوب جاننے والا ہے' اس کے علم سے کائنات کا کوئی ذرّہ خارج نہیں' وہ غیر محسوس اور غیر مادی چیزوں کا علم بھی رکھتا ہے۔

تعارض و اختلاف سے محفوظ ہے

کتاب اللہ میں چونکہ کذب و افترا کا کوئی شائبہ تک نہیں اور یہ ہر قسم کے عیب اور نقص سے بھی منزّہ ہے اس لیے اس کا کلام بھی تعارض و اختلاف سے محفوظ ہے: ﴿اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۭ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ۝۸۲﴾ (النساء) ''کیا غور نہیں کرتے قرآن میں؟ اور اگر ہوتا یہ کسی اور کا سوا اللہ کے تو ضرور پاتے اس میں بہت تفاوت''۔ قرآن نے یہ بھی واضح کر دیا کہ اس کا ذریعۂ نزول موثق اور مستند ہے اور اس کو ایک امانت دار فرشتے نے نبی کریم ﷺ کے قلب پر اُتارا ہے۔ وہ اپنی خواہش سے باتیں نہیں بناتے' ان کا ارشادِ گرامی خالص وحی ہے جو انؐ پر نازل کی جاتی ہے۔ فرمایا: ﴿اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۝۱۹ ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ۝۲۰ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ ۝۲۱﴾ (التکویر) ''یہ فی الواقع ایک بزرگ پیغام بر کا (پہنچایا ہوا) قول ہے' جو بڑی قوّت والا ہے' عرش والے کے ہاں بلند مرتبہ ہے' وہاں اس کا حکم مانا جاتا ہے' وہ امانت دار بھی ہے''۔ اس کے مقابلے میں انسان کا کلام محسوسات کے دائرے میں مقید ہے' مابعد الطبیعیات کی وسیع دنیا سے وہ شناسا نہیں' وہ تو اپنی حقیقت سے بھی آگاہ نہیں۔ وہ صرف اپنی عقل پر بھروسہ اور اعتماد کرتا ہے' مگر اس کی عقل ناتمام ہے' ظن و قیاس اور تخمین کے دوائر میں محدود ہے۔ اگر وہ اپنے لیے خود کوئی دستورِ زندگی وضع کرے گا تو اس میں ہزار غلطیوں کا امکان ہوگا۔ قرآن نے کہا: ﴿وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ۝۸۵﴾ (بنی اسراء یل) ''اور تم کو علم دیا گیا ہے تھوڑا سا۔''

واضح اور مفصّل کلام ہے

دین کے اصول و مبادی اور وہ علم جو انسان کی نجاتِ اُخروی کا ضامن ہے اور دُنیوی فلاح و کامرانی کا انحصار بھی اس پر ہے' وہ واضح بھی ہے اور مفصل و محکم بھی۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰي عِلْمٍ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝۵۲﴾ (الاعراف) ''اور ہم نے ان کے پاس کتاب پہنچا دی ہے جس کو علم و دانش کے ساتھ کھول کھول کر بیان کر دیا ہے (اور) وہ مؤمن لوگوں کے لیے ہدایت و رحمت ہے''۔ سورۂ ھود میں فرمایا: ﴿الۗرٰ ۣ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ۝۱﴾

''الف لام را' یہ کتاب ہے جس کی آیات (اپنے مطالب و دلائل میں) مستحکم ہیں' پھر خدائے حکیم وخبیر کی طرف سے کھول کر بیان کر دی گئی ہیں''۔ گویا فرقان حمید کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو مکمل دستور العمل اور طریقِ حیات عطا کر دیا ہے' جس میں کسی پیوند کاری کی ضرورت موجود نہیں۔منصوص فرائض واحکام کی تشریح خود حضور نبی اکرم ﷺ نے فرما دی ہے' جو صرف پیغام رساں ہی نہ تھے' بلکہ عملی طور پر شارح بھی تھے۔

حق و باطل کا فارق ہے

قرآن مجید کا ایک اہم وصف یہ ہے کہ وہ حق و باطل کا فرق کھول کر رکھ دینے والی کتاب ہے۔ دو چیزوں کو الگ کرنے والی ہے۔ ایمان وکفر' اسلام اور جاہلیت' حلال وحرام اور جائز و ناجائز میں فرق و امتیاز پیدا کرنے والی ہے۔ضعیف سے ضعیف اشتباہ کو بھی اس کتاب حکیم نے دور کر دیا ہے۔فرمایا:﴿تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرَا ۝۱﴾ (الفرقان) ''نہایت متبرک ہے وہ جس نے یہ فرقان اپنے بندے پر نازل کیا تاکہ سارے جہان والوں کے لیے نذیر ہو''۔دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ﴾ (البقرۃ:۲۵۶) ''بلاشبہ ہدایت کی راہ گمراہی سے الگ اور نمایاں ہوگئی''۔ پھر فرمایا:﴿لِيَمِيْزَ اللّٰهُ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ﴾ (الانفال:۳۷) ''تاکہ اللہ گندگی کو پاکیزگی سے چھانٹ کر الگ کر دے''۔قرآن کریم کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے قبل انبیاء و رسل پر نازل کی جانے والی کتب کی یہ تصدیق کرنے والا ہے اور یہ صحیح معنوں میں ان پر نگران ہے۔ مرورِ ایام کے ساتھ ان سابقہ کتب سماویہ میں تحریف کی جاتی رہی' حالانکہ اساسیاتِ دین میں سب یکساں تھیں' مگر یہ سب ایک مقررہ وقت کے لیے تھیں' جبکہ ان کے مقابلے میں قرآن مجید ایک دائمی صحیفہ ہے اور نازل کرنے والے نے اس کی حفاظت کا ذمہ خود اٹھایا ہے:﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝۹﴾ (الحجر) ''رہا یہ ذکر تو اس کو ہم نے نازل کیا ہے اور ہم خود ہی اس کے نگہبان ہیں''۔ گویا اللہ نے فرما دیا کہ یہ ذکر یعنی قرآن براہِ راست ہماری حفاظت میں ہے۔نہ تمہارے مٹائے مٹ سکے گا اور نہ کبھی کسی کو اس میں تحریف اور ردّ و بدل کرنے کا موقع مل سکے گا۔

قرآن نورِ مبین ہے

قرآن مجید بنی نوعِ انسان کو جادۂ مستقیم پر گامزن کرنے کا داعی ہے' وہ راست روی اور

سلامت روی کی راہ پر چلنے کی ہدایت کرتا ہے۔سلامتی کے راستہ کو نور سے تعبیر کرتا ہے اور کج روی وکج فکری کو نہ صرف گمراہی سے موسوم کرتا ہے' بلکہ اسے ظلمت (اندھیرا) قرار دیتا ہے۔ گھنگھور اندھیروں اور تاریک فضاؤں کو ہدایت کی روشنی سے منور کرتا ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۝۱۵ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝۱۶﴾ (المائدۃ)

''تمہارے پاس اللہ کی طرف سے روشنی آ گئی ہے اور ایک ایسی حق نما کتاب جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو اس کی رضا کے طالب ہیں' سلامتی کے طریقے بتاتا ہے اور اپنے اذن سے ان کو اندھیروں سے نکال کر اجالے کی طرف لاتا ہے اور راہِ راست کی طرف ان کی رہنمائی کرتا ہے۔''

سلامتی نام ہی اس بات کا ہے کہ انسان غلط بینی' غلط اندیشی اور غلط کاری سے مجتنب رہے۔ سُبُلَ السَّلَامِ کے الفاظ اس کی بہترین تعبیر ہیں۔قرآن اس کے لیے ایسی راہیں کھولتا ہے جو متوازن اور معتدل ہوں' قرآن کہتا ہے:

﴿وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ﴾ (الانعام:۱۵۳)

''اور یہی میرا سیدھا راستہ ہے لہٰذا تم اس پر چلو' اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ اس راستے سے ہٹا کر تمہیں پراگندہ کر دیں گے۔''

ظلمات سے نجات کا ذریعہ ہے

اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم کو نور کہا مگر اس کے مقابلے میں ''ظلمت'' کے بجائے ''ظلمات'' کا لفظ استعمال کیا' یعنی جب وحی کی روشنی نہ ہو تو زندگی بے شمار ظلمتوں میں گھر جاتی ہے' پھر ان کا کوئی حد وحساب نہیں ہوتا۔ ہر سو جہالت وغوایت' اوہام اور مفروضات' جور وظلم اور جبر وتعدّی غرضیکہ زندگی کا کوئی گوشہ ظلمات سے محفوظ نہیں رہتا:

﴿ظُلُمٰتٌ ۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ۭ اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا ۭ﴾ (النور)

''غرض اندھیرے ہی اندھیرے ہیں ایک پر ایک (چھایا ہوا)۔ایسی حالت ہے کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا۔''

گویا قرآن روشنی کا مینار ہے' یہ وحی کی روشنی سے مستنیر ہے۔ جو انسان اس کی ضیاباریوں سے

استفادہ کرتا ہے' مختلف شعبہ ہائے زندگی کو اس کی روشنی میں اجالتا ہے' تمام امور زندگی میں فرقان حمید سے رہنمائی طلب کرتا ہے' اسے کامرانی نصیب ہوتی ہے۔

قرآن آئینہ کی مانند ہے

قرآن حکیم ایک ایسے آئینے کی مانند ہے کہ جس میں ایک فرد یا قوم بخوبی معلوم کرسکتی ہے کہ وہ کس مقام پر کھڑی ہے۔ قرآن نے عقائد صحیحہ کی وضاحت فرمادی ہے اور زندگی کو کس ڈھنگ سے گزارا جائے اس کے لیے احکامات بھی دے دیے ہیں۔ اب اعمال کیسے ہوں' اخلاق کس نہج پر ہوں' حقوق وفرائض کا دائرہ کار کیا ہو' معروف ومنکر میں فرق کیا ہے' حلال و حرام کی حدود کیا ہیں' قوموں کو عروج کیسے نصیب ہوتا ہے اور وہ ذلّت وادبار کے گڑھے میں کب گرتی ہیں' بندۂ مؤمن کی پہچان کیا ہے' اللہ کی بندگی کی نوعیت کیا ہے' عبودیت کا حسن کسے حاصل ہوتا ہے' اللہ سے سرکشی اور بغاوت کا انجام کیا ہوتا ہے' فضائل ورذائل میں تمیز کیسے کی جائے گی' ان تمام امور کے بارے میں اس آئینے میں اپنا جائزہ لے کر احتساب کیا جاسکتا ہے۔ قرآن نے کہا: ﴿لَقَدْ اَنْزَلْنَا اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۝۱۰﴾ (الانبیاء) ''لوگو' ہم نے تمہاری طرف ایسی کتاب بھیجی ہے جس میں تمہارا ہی ذکر ہے' کیا تم سمجھتے نہیں ہو؟''

چشم بینا اللہ سے طلب کی جائے' قرآن کے مقدس اوراق پر ثبت اہلِ ایمان کے خصائص پر نظر دوڑائی جائے' بندۂ مؤمن کی اذان سے جو سحر طلوع ہوتی ہے اس کے خال وخط دیکھے جائیں' اس کی آہ سحرگاہی سے جو پو پھوٹتی ہے اس کی ضیاباریوں سے نور اخذ کرنے کا سلیقہ سیکھا جائے اور پھر قبائح وذمائم سے بھرپور زندگی کے ثمرات کو دیکھا جائے تو انسان کی ایک تصویر نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ یوں قرآن حکیم میں اپنا تذکرہ تلاش کرنا سہل اور آسان ہوجاتا ہے اور زندگی کا ایک واضح رخ متعیّن کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔

قرآن میں ماضی کی اقوام کا تذکرہ کیوں؟

قرآن نے اپنے اوراق کریمہ میں ان قوموں کا ذکر کیا جو پھلی اور پھولیں' خوشحالی سے ہمکنار ہوئیں' مگر عیش وطرب کی وجہ سے انہوں نے اپنے خالق ومالک کو فراموش کردیا اور پھر اپنی حقیقت بھی بھول گئیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ان کے افعال وجرائم کا ذکر کیا' انبیاء کرام علیہم السلام سے ان کے سلوک کا جابجا تذکرہ کیا۔ وہ اپنے بھیانک جرائم کی بدولت تباہ وبرباد ہوئیں' وہ زمین میں دھنس گئیں' ان کا نام ونشان تک موجود نہ رہا۔ اولوالابصار سے کہا گیا کہ وہ ان

کے واقعات سے عبرت حاصل کریں اور گزشتہ قوموں کے تذکروں کو کہانی نہ سمجھیں۔ قرآن مینارۂ نور ہے اور رسول کریم ﷺ اس کے شارح ہیں۔ یہ زندۂ جاوید کتاب ہے۔ یہاں جدید وقدیم کی کوئی مغائرت نہیں' اس کا خطاب سب انسانوں سے ہے۔ فرمایا: ﴿لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ؕ مَا كَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ۝۱۱۱﴾ (یوسف) ''بلاشبہ پہلی قوموں کے (عروج و زوال) کی داستانوں میں (درس) عبرت ہے سمجھ داروں کے لیے۔ نہیں ہے یہ قرآن ایسی بات جو (یونہی) گھڑ لی گئی ہو' بلکہ یہ تصدیق کرتی ہے ان کتابوں کی جو اس سے پہلے نازل ہوئی ہیں اور یہ (قرآن) ہر چیز کی تفصیل ہے اور سراپا ہدایت ورحمت ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں۔''

قرآن آسان ہے

انسان اگر فطرتِ صحیحہ پر قائم رہے اور قرآن پڑھنے' سننے' اس پر غور کرنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کا پکّا ارادہ کرلے تو اس چشمۂ صافی کی شفافیت سے اپنے آپ کو سنوار بھی سکتا ہے اور نکھار بھی سکتا ہے۔ قرآن کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ آسان ہے اور اتارنے والے نے اسے آسان بنایا ہے۔ فرمایا: ﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ۝۱۷﴾ (القمر) ''اور ہم نے قرآن کو نصیحت پکڑنے کے لیے آسان کیا ہے' تو کوئی ہے یاددہانی حاصل کرنے والا؟'' اس میں جو مضامین ترغیب وترہیب اور انذار وتبشیر کے لیے ہیں' انہیں سمجھنے میں کوئی دقّت پیش نہیں آتی' مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ یہ محض ایک سطحی کتاب ہے اور حقائق وغوامض سے تہی ہے' اس میں معارف وحقائق بھی ہیں اور باریکیاں بھی ہیں۔ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ((لَا تَنْقَضِيْ عَجَائِبُهٗ)) یعنی اس کے اسرار وعجائب ختم ہونے والے نہیں۔ علمائے اُمت ہمیشہ اس کے اسرار ورموز کی تہہ تک پہنچنے میں مصروف رہے ہیں اور لعل و گہر کی نمود ہمیشہ جاری رہی ہے۔ البتہ نصیحت کے حصول میں کوئی امر مانع نہیں ہوتا۔ یہ بات ذہن میں مستحضر رہنی چاہیے کہ علمِ صحیح اور عربی زبان سے واقفیت کے بغیر اسے سمجھا نہیں جاسکتا اور حدیث وفقہ سے بے نیاز ہوکر اس سے احکام بھی مستنبط نہیں کیے جاسکتے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ان سرکش اور باغی اقوام کا ذکر کیا ہے جن پر عذاب نازل ہوئے۔ یہ سمجھانے کا ایک ذریعہ تھا' جبکہ دوسرا قرآنی دلائل کے ذریعے وعظ وتلقین کا ہے' اور یہ راہ زیادہ آسان ہے اور اس سے فائدہ اٹھانا مشکل نہیں ہے۔

معجز نما کتاب

قرآن حکیم ایک معجز نما کتاب ہے' خود اللہ تعالیٰ نے رسول کریم ﷺ کو حکم دیا کہ وہ اس کے ذریعہ مشرکینِ عرب کو چیلنج کریں۔ فرمایا:

﴿قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا﴾ (بنی اسراء یل)

''کہہ دو کہ اگر تمام انسان اور جن اس بات پر مجتمع ہوں کہ اس قرآن جیسا بنا لائیں تو اس جیسا نہ لاسکیں گے اگر چہ وہ ایک دوسرے کے مددگار رہوں۔''

سورۂ یونس میں فرمایا:

﴿اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۭ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾

''کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ خود گھڑ لایا ہے؟ کہہ دو کہ تم لے آؤ ایک ہی سورت ایسی اور بلا لو جس کو بلا سکو اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو۔''

مشرکین اس چیلنج کا سامنا نہ کر سکے' اس لیے کہ یہ کتاب صرف الفاظ و تراکیب ہی میں معجزہ نہیں' بلکہ معانی' مضامین اور علوم و معارف کے اعتبار سے بھی معجزہ ہے۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی کے بارے میں جو ہدایات دی گئی ہیں وہ بھی معجزہ ہیں اور اس کا پیرایۂ بیان بھی ایسا ہے کہ کوئی دوسرا اسلوب اس کے ہم مثل نہیں۔ نبی مکرم ﷺ نے فرمایا:

((مَا مِنَ الْاَنْبِيَاءِ نَبِيٌّ اِلَّا اُعْطِيَ مِنَ الْاٰيَاتِ مَا مِثْلُهٗ اٰوْمِنَ [أَوْ آمَنَ] عَلَيْهِ الْبَشَرُ وَاِنَّمَا كَانَ الَّذِيْ اُوْتِيْتُ وَحْيًا اَوْحَاهُ اللّٰهُ اِلَيَّ فَاَرْجُوْ اَنِّيْ اَكْثَرُهُمْ تَابِعًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ)) (۱)

''جتنے بھی انبیاء گزرے ہیں ان میں سے ہر ایک کو کوئی نہ کوئی ایسا (محسوس) معجزہ دیا گیا ہے جسے دیکھ کر لوگ ایمان لائے' لیکن مجھے جو چیز (بطور معجزہ) دی گئی ہے وہ یہ وحی ہے جو اللہ نے میری طرف کی ہے (جو قیامت تک باقی رہنے والی ہے) پس میں اُمید رکھتا ہوں کہ قیامت کے روز میرے پیروؤں کی تعداد ان سب سے زیادہ ہوگی۔''

(۱) صحیح البخاری' کتاب الاعتصام بالکتاب والسنة' باب قول النبی ﷺ بعثت بجوامع الکلم۔

اقامتِ دین کی اوّلین بنیاد

اقامتِ دین کے لیے قرآن حکیم اوّلین بنیاد ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے ۲۳ برس تک اس رفیع الشان کتاب کی رہنمائی میں اسلامی نظام کی تشکیل کی۔ آپ ﷺ نے تعلیم قرآن کی فضیلت کو یوں بیان فرمایا:

((خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهٗ)) (۱)

''تم میں سب سے اچھا وہ ہے جس نے قرآن سیکھا اور سکھایا۔''

دوسری حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اَلْمَاهِرُ بِالْقُرْآنِ مَعَ السَّفَرَةِ الْكِرَامِ الْبَرَرَةِ ' وَالَّذِيْ يَقْرَأُ الْقُرْآنَ وَيَتَتَعْتَعُ فِيْهِ وَهُوَ عَلَيْهِ شَاقٌّ لَهٗ اَجْرَانِ)) (۲)

''(قیامت کے دن) قرآن کا عالم فرماں بردار' بزرگ فرشتوں کے ساتھ ہوگا (جو رسولوں کو پیغام پہنچانے پر مامور تھے) اور جو شخص قرآن اٹک اٹک کر بڑی مشقت سے پڑھتا ہے اس کو دہرا ثواب ملے گا۔''

اُمّتِ مُسلمہ کے عروج و زوال کا سبب

جو افراد' گروہ یا قومیں قرآن پر ایمان لانے کے بعد اس پر عمل بھی کریں گی ربِ کریم انہیں عزت و خوشحالی اور شوکت و سطوت سے نوازے گا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ اللّٰهَ يَرْفَعُ بِهٰذَا الْكِتَابِ اَقْوَامًا وَيَضَعُ بِهٖ آخَرِيْنَ)) (۳)

''بے شک اللہ تعالیٰ اِس قرآن کے ذریعے بہت سی قوموں کو بلند کرتا ہے اور دوسری بہت سی قوموں کو اس کے ذریعے پستی میں گراتا ہے۔''

ایک روایت میں یہ بھی مذکور ہے کہ کتاب اللہ کی پیروی کرنے والے نہ دنیا میں گمراہ ہوں گے اور نہ آخرت میں۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

مَنِ اقْتَدٰى بِكِتَابِ اللّٰهِ لَا يَضِلُّ فِي الدُّنْيَا وَلَا يَشْقٰى فِي الْاٰخِرَةِ' ثُمَّ تَلَا

(۱) صحیح البخاری' کتاب فضائل القرآن' باب خیرکم من تعلم القرآن وعلمه۔

(۲) صحیح مسلم' کتاب صلاة المسافرین وقصرها' باب فضل الماهر فی القرآن والذی یتتعتع فیه۔

(۳) صحیح مسلم' کتاب صلاة المسافرین وقصرها' باب فضل من یقوم القرآن ویعلمه.....

هٰذِهِ الْاٰيَةُ :﴿فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَایَ فَلَا یَضِلُّ وَلَا یَشْقٰی﴿۱۲۳﴾﴾ (۱)

''جو شخص اللہ کی کتاب کی پیروی کرے گا وہ نہ تو دنیا میں بے راہ ہوگا اور نہ آخرت میں اس کے حصے میں محرومی آئے گی۔ پھر انہوں نے یہ آیت پڑھی: ﴿فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَایَ فَلَا یَضِلُّ وَلَا یَشْقٰی﴿۱۲۳﴾﴾ (طٰہٰ) کہ جو شخص میرے ہدایت نامہ کی پیروی کرے گا وہ نہ تو (دنیا میں) بھٹکے گا اور نہ (آخرت میں) بدبختی سے دوچار ہوگا۔''

نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ قرآن سے غفلت نہ برتنا اور نہ ہی اسے دُنیوی جاہ و مرتبہ اور مال و دولت کے حصول کا ذریعہ بنانا۔ حضرت عبیدۃ الملیکی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((یَا اَهْلَ الْقُرْآنِ لَا تَتَوَسَّدُوا الْقُرْآنَ، وَاتْلُوْهُ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ مِنْ آنَاءِ اللَّیْلِ وَالنَّهَارِ، وَاَفْشُوْهُ وَتَغَنَّوْهُ وَتَدَبَّرُوْا مَا فِیْهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ، فَلَا تَعَجَّلُوْا ثَوَابَهٗ فَاِنَّ لَهٗ ثَوَابًا)) (۲)

''اے قرآن کے ماننے والو! قرآن کو تکیہ مت بنانا، اور رات دن کے اوقات میں اس کی ٹھیک ٹھیک تلاوت کرنا، اور اس کے پڑھنے پڑھانے کو رواج دینا، اور اس کے الفاظ کو صحیح طریقہ سے پڑھنا، اور جو کچھ قرآن میں بیان ہوا ہے (ہدایت حاصل کرنے کی غرض سے) اس پر غور و فکر کرنا تاکہ تم کامیاب ہو، اور اس کے ذریعہ دنیاوی نتیجہ کی خواہش نہ کرنا بلکہ اللہ کی خوشنودی کے لیے اس کو پڑھنا۔''

تلاوتِ قرآن کے ثمرات

جو دل قرآن کے انوار و تجلیات سے منور و مجلّٰی اور سعادت سے بہرہ مند ہوتا ہے، یہی وہ دل ہے جسے زندہ و بیدار کہا جا سکتا ہے۔ اللہ اسے راحت و فرحت اور سکینت سے نوازتا ہے۔ اور جو دل قرآن کی تلاوت، اس پر غور و فکر اور اس پر عمل کرنے سے غافل ہو وہ قساوت، خجالت اور خسّت کی آماجگاہ بن جاتا ہے اور شدت کی بنا پر زنگ آلود ہو کے رہ جاتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے پوچھا گیا کہ ایسی کیفیت کا علاج کیا

(۱) رواہ رزین ۔ مشکوٰۃ المصابیح، باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، الفصل الثالث۔

(۲) رواہ البیہقی فی شعب الایمان۔ مشکوٰۃ المصابیح، کتاب فضائل القرآن، باب آداب التلاوۃ ودروس القرآن، الفصل الثالث۔

ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ هٰذِهِ الْقُلُوْبَ تَصْدَأُ كَمَا یَصْدَأُ الْحَدِیْدُ اِذَا اَصَابَهُ الْمَاءُ)) قِیْلَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ: وَمَا جِلَاؤُهَا؟ قَالَ: ((كَثْرَةُ ذِكْرِ الْمَوْتِ وَتِلَاوَةُ الْقُرْآنِ)) (۱)

''یقیناً ان دلوں کو بھی زنگ لگ جاتا ہے جیسا کہ لوہے کو پانی پڑنے سے زنگ لگ جاتا ہے''۔ پوچھا گیا کہ دلوں کے زنگ کو دور کرنے والی کیا چیز ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''دل کا زنگ اس طرح دور ہوتا ہے کہ آدمی موت کو بہت یاد کرے اور قرآن کی تلاوت کرے۔''

جو لوگ قرآن کی تلاوت کرتے ہیں اور اس کے معانی پر سوچ بچار کرتے ہیں، اللہ کے ہاں ان کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ تلاوت تو بعثتِ انبیاء کے اوّلین مقاصد میں سے ہے اور یقیناً اللہ کی رحمت تلاوت کرنے والوں کو اپنی آغوش میں لے لیتی ہے اور انہیں سکون اور قرار میسّر آتا ہے۔ قیامت کے دن قرآن پر عامل حافظِ قرآن کے والدین کو بہت بڑا اعزاز و اکرام عطا کیا جائے گا، ان کو سورج سے زیادہ تابناک تاج پہنایا جائے گا۔ شرط یہ ہے کہ قرآن حکیم کو طلبِ ہدایت کے لیے پڑھا جائے اور خلوصِ قلب سے اس پر عمل پیرا ہوا جائے اور اس مقصدِ عظیم اور نصب العین کو نگاہ میں رکھا جائے جس کے لیے اللہ نے قرآن نازل کیا ہے۔

اخذ و استفادہ

☆ تفہیم القرآن، جلد اول تا پنجم ☆ تفسیر قرآن، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ

☆ مطالعہ قرآن کے اصول و مبادی، مولانا ابوالحسن علی ندویؒ

☆ فکری تربیت کے اہم تقاضے، ڈاکٹر یوسف القرضاوی

☆ ترجمان الحدیث، سید محمود حسن

☆ راہِ عمل، جلیل احسن ندوی

(۱) رواہ البیہقی فی شعب الایمان۔ مشکوٰۃ المصابیح، کتاب فضائل القرآن، الفصل الثالث۔

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت و تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

داعی اور دعوتِ دین کا دائرہ کار

حافظ محمد مشتاق ربّانی

حق کا داعی ہو یا باطل کا‘ دونوں صورتوں میں کسی کو بھی دعوت سے زیادہ کا اختیار نہیں ہے۔ انبیاء کرام علیہم السلام کو بھی یہ اختیار حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی کو زبردستی ہدایت پر لے آئیں۔ ارشاد ہے: ﴿اِنَّكَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ ۚ﴾ (القصص:۵۶) ’’آپؐ جن کو چاہیں‘ ہدایت نہیں دے سکتے‘ بلکہ اللہ ہی جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے‘‘۔ اسی طرح شیطان کو بھی یہ طاقت حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی کو زبردستی گمراہی کے راستے پر گامزن کر سکے‘ جیسا کہ قیامت کے دن شیطان جہنم میں جانے والوں سے کہے گا: ﴿وَمَا كَانَ لِیَ عَلَیْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّاۤ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِیْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِیْ وَلُوْمُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ﴾ (ابراھیم: ۲۲) ’’اور مجھے تو تم پر کوئی اختیار نہیں تھا‘ بس میں نے تمہیں دعوت دی اور تم نے میری بات مان لی‘ تو اب تم مجھے ملامت نہ کرنا بلکہ اپنے آپ ہی کو ملامت کرو۔‘‘

داعی کے پاس زبردستی ہدایت دینے کا اختیار نہ ہونے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ دعوتِ دین ایک ایسا عمل ہے کہ یہ فریضہ ادا کرتے ہوئے داعی کو صرف مدعو کو دعوت دینی چاہیے‘ اس پر مسلط نہیں ہونا چاہیے۔ داعی کے ذمہ صرف ابلاغ و تبلیغ ہے۔ یہی بات نبی اکرم ﷺ سے کہی گئی کہ اپنی قوم کو صرف اللہ کا پیغام پہنچائیں‘ آپ کی حیثیت نذیر و بشیر کی ہے‘ پیغام پہنچانے کے باوجود اگر وہ گمراہ رہتے ہیں تو آپ ان کی گمراہی کے ذمہ دار نہ ہوں گے‘ لیکن آپ ﷺ کو اپنی اُمت سے اس قدر محبت تھی کہ آپؐ ان کی گمراہی کو دیکھ کر کڑھتے رہتے‘ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی اندرونی حالت کے بارے میں بتایا: ﴿فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰۤی اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ یُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِیْثِ اَسَفًا ۝۶﴾ (الکھف) ’’تو شاید آپؐ اس غم میں کہ وہ ایمان نہیں لائے اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالیں گے!‘‘ گویا آپ ﷺ کو اس غم و پریشانی سے نکلنے کے لیے کہا جا رہا ہے۔

اس سلسلے میں ہمیں قرآن حکیم میں چند ایسے کلمات ملتے ہیں جن میں آپ ﷺ کو اپنی

اُمت پر داروغہ بننے سے منع کیا گیا ہے۔ آیئے ان کلمات کا اختصار سے جائزہ لیں۔

وَکِیل: جب یہ لفظ اسمائے حسنیٰ کے حوالے سے استعمال ہو تو اس کا مفہوم کارساز یا اس کے قریب قریب کسی لفظ سے کریں گے‘ اور جب نبی کریم ﷺ سے کہا جائے کہ آپ ان پر وکیل نہیں ہیں تو اس وقت وکیل کے معنی ہیں کہ آپ ان کے اعمال کے ذمہ دار نہیں ہیں کہ وہ کیا کر رہے ہیں اور کیا نہیں کر رہے ہیں‘ بلکہ آپ کی حیثیت تو ایک منذر کی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿قُلْ لَّسْتُ عَلَیْكُمْ بِوَكِیْلٍ ۝۶۶﴾ (الانعام) ’’کہہ دو کہ میں تمہارے اعمال کا ذمہ دار نہیں ہوں‘‘۔ اسی مفہوم کے اور جملے بھی قرآن حکیم میں وارد ہوئے ہیں‘ جیسے: ﴿وَمَاۤ اَنْتَ عَلَیْهِمْ بِوَكِیْلٍ ۝۱۰۷﴾ (الانعام) ’’اور میں تمہارے کاموں کا ذمہ دار نہیں ہوں۔‘‘

حَفِیظ: نگہبان۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کو ماپ تول میں کمی کرنے سے منع کیا اور ساتھ ہی فرمایا: ﴿وَمَاۤ اَنَا عَلَیْكُمْ بِحَفِیْظٍ ۝۸۶﴾ (ھود) ’’اور میں تمہارے اوپر نگہبان نہیں ہوں‘‘۔ کہ تم کوئی غلط کام نہ کرو۔ اچھے اور برے اعمال کرنے میں تمہیں اختیار ہے۔ اسی طرح نبی کریم ﷺ سے فرمایا گیا: ﴿وَمَا جَعَلْنٰكَ عَلَیْهِمْ حَفِیْظًا ۚ﴾ (الانعام:۱۰۷) ’’اور ہم نے آپؐ کو ان کے اوپر کوئی نگہبان نہیں بنایا ہے۔‘‘

مُصَیطِر: اس کا مادہ ’’س ط ر‘‘ اور ’’ص ط ر‘‘ دونوں طرح درست ہے۔ اس لیے قرآن حکیم میں جہاں **مصیطر یا المصیطرون** آیا ہے‘ وہاں ص کے اوپر س بھی لکھا ہوتا ہے۔ اس کے بارے میں ہم تجوید کی کتابوں کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ عکسی تجویدی قرآن مجید جو دارالفصیح ٹرسٹ لاہور سے شائع ہوا ہے‘ اس مصحف کے آغاز میں تجوید کے قواعد درج ہیں۔ اس میں ایک باب رسم الخط قرآنی ہے جس میں تجوید اور رسم الخط کے حوالے سے یہ قاعدہ درج ہے کہ: ’’قرآن مجید میں چار ایسے کلمات آئے ہیں کہ وہ لکھے تو ’’ص‘‘ سے جاتے ہیں‘ لیکن اس ’’ص‘‘ کے قریب ہی اوپر یا نیچے چھوٹا سا ’’س‘‘ درج کر دیا جاتا ہے۔ وہ مقامات حسب ذیل ہیں:

(۱) **یَبْصُطُ** (البقرۃ:۲۴۵) (۲) **بَصْطَۃ** (الاعراف:۶۹) (۳) **هُمُ الْمُصَیْطِرُون** (الطور:۳۷) **بِمُصَیْطِر** (الغاشیۃ:۲۲)۔ پہلے دو کلموں میں ’’س‘‘ کا تلفظ ادا کرنا چاہیے اور چوتھے کلمے میں ’’ص‘‘ کا۔ تیسرے کلمے میں ص کا تلفظ ادا کیا جائے یا ’’س‘‘ کا‘ دونوں طرح جائز ہے۔ ہمارے زیر بحث جو کلمہ ہے وہ ’’**مصیطر**‘‘ ہے جس کے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ اس میں ص کا تلفظ ادا کرنا چاہیے۔

مُصَیطِر کے معنی مسلّط ہونے والے کے ہیں۔ ''مختار الصحاح'' میں مادہ س ط ر کے تحت لکھا ہے: **المصیطر: المسلط علی الشیء لیشرفَ علیه ویتعهد أحواله ویکتبَ عمله** یعنی وہ شخص جس کو کسی پر مسلط کر دیا جائے تا کہ وہ اس کے اعمال کی نگرانی کرے' اس کے احوال کی خبر رکھے اور اس کے اعمال کو لکھتا رہے۔ پیارے حبیب ﷺ سے فرمایا گیا: ﴿فَذَكِّرْ ۗ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ ﴿٢١﴾ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ﴿٢٢﴾﴾ (الغاشیة) ''بس آپؐ نصیحت کریں' آپؐ تو صرف نصیحت کرنے والے ہیں۔ ان کے اوپر کوئی داروغہ نہیں ہیں۔''

جَبّار: یہ مبالغہ کا صیغہ ہے' جس کے معنی بہت زیادہ زبردستی کرنے والے کے ہیں۔ ارشاد ہے: ﴿وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ ۗ﴾ (ق: ۴۵) ''اور آپؐ ان پر زبردستی کرنے والے نہیں ہیں''۔ آپ ﷺ کی دعوت ایسی نہیں ہی کہ اسے ٹھونسا جائے' بلکہ یہ تو ایسی ہے کہ اسے خوشدلی سے قبول کیا جائے۔ ایک دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿٩٩﴾﴾ (یونس) ''تو کیا آپ لوگوں پر زبردستی کرنا چاہتے ہیں' کہ وہ مؤمن ہو جائیں!''

مَلِك: فرشتہ۔ نبی کریم ﷺ کی دعوتِ ایمان کے جواب میں مشرکینِ مکہ یہ کہتے کہ ہم تم پر ایمان نہیں لائیں گے یہاں تک کہ تم ہمارے لیے زمین سے کوئی چشمہ جاری کرو یا تمہارے لیے کھجوروں اور انگوروں کا کوئی باغ ہو اور اس کے بیچ میں نہریں بہا نکالو' یا جیسا تم کہا کرتے ہو ہم پر آسمان سے ٹکڑے لا گراؤ یا اللہ اور فرشتوں کو (ہمارے) سامنے لاؤ' یا تمہارے سونے کا گھر ہو' یا تم آسمان پر چڑھ جاؤ اور ہم تمہارے چڑھنے کو بھی نہیں مانیں گے جب تک کوئی کتاب نہ لاؤ جسے ہم پڑھ بھی لیں۔ (یہ سورۂ بنی اسرائیل کی آیات ۹۰ تا ۹۳ کا مفہوم ہے) ان سب مطالبات کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴿٩٣﴾﴾ (بنی اسرائیل) ''کہہ دو کہ میرا پروردگار پاک ہے' میں تو صرف ایک پیغام پہنچانے والا انسان ہوں''۔ کوئی فرشتہ یا ما فوق البشر کوئی ہستی نہیں ہوں۔ میں تو اپنے نفع و نقصان کا بھی اختیار نہیں رکھتا چہ جائیکہ میں ان مطالبات میں سے کوئی مطالبہ پورا کر سکوں۔

دعوت کا یہ پہلو کہ ہماری ذمہ داری کہاں تک ہے' اپنے سامنے رکھنے کے بڑے فوائد ہیں' جن میں سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ داعی تھکتا نہیں ہے' اس کی ہمت جواب نہیں دیتی اور وہ ہر دم جواں رہتا ہے' لیکن اگر داعی دعوت کی حدود متعیّن کرنے میں غلطی کرے تو اس کے لیے کئی مسائل پیدا ہو جائیں گے' جیسا کہ مولانا امین احسن اصلاحی اپنی کتاب ''دعوتِ دین اور

اس کا طریق کار'' میں لکھتے ہیں:

> ''بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ داعی اپنی ذمہ داری کی حدود متعیّن کرنے میں غلطی کر جاتا ہے۔ وہ سمجھنے لگ جاتا ہے کہ اس پر صرف اسی حد تک ذمّہ داری نہیں ہے کہ وہ حق کو لوگوں تک ٹھیک ٹھیک پہنچا دے' بلکہ وہ اس بات کا بھی ذمّہ دار ہے کہ لوگ اس حق کو قبول بھی کر لیں۔ اس غلطی کا لازمی نتیجہ ایک تو یہ ہوتا ہے کہ داعی کے اندر حقِ خالص کو پیش کرنے کی بجائے مخالفین کے باطل عقائد و افکار کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کا رجحان پیدا ہوتا ہے' اور دوسرا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک بالکل غلط ذمہ داری اپنے سر اُٹھا لینے کی وجہ سے اپنی زندگی سخت افکار اور الجھنوں میں ڈال دیتا ہے۔ اس طرح کی غلطیوں سے بچانے کے لیے قرآن مجید نے مفصل ہدایات دی ہیں۔'' (ص ۱۷۱)

یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ دین کا حکم و اقامت صرف دعوتِ دین سے ممکن نہیں' جیسا کہ بعض مسلمانوں نے سمجھ رکھا ہے۔ انہوں نے اپنے آپ کو صرف دعوتِ دین تک محدود کر رکھا ہے۔ انہیں اس سلسلے میں سخت ٹھوکر لگی ہے' باوجود اس کے کہ وہ لوگ اُمت کا بہت بڑا سرمایہ ہیں' انتہائی مخلص ہیں' دین کے لیے ان کی بڑی قربانیاں ہیں' دعوت کے میدان میں ہمارے لیے ایک روشن مثال ہیں' ان کا وجود معاشرے کے لیے باعث خیر و برکت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مقدور بھر دعوت دینے کے بعد بھی کئی سنگ ہائے میل آتے ہیں جن سے گزر کر قتال فی سبیل اللہ کی بھی نوبت آتی ہے۔ لیکن دعوتِ دین سے آگے قدم بڑھانا ہماری بعض دینی جماعتوں کے لائحہ عمل کا حصہ ہی نہیں ہے۔ قتال فی سبیل اللہ کی جانب بڑھنا تو درکنار جہاد و قتال کی اصطلاحات استعمال کرنے سے بھی وہ گریزاں ہیں۔ جبکہ جہاد و قتال کے بغیر دین کی اقامت کا تصور دھندلا ہے۔ آج جہاد و قتال کی اصطلاحات اتنی غیر مانوس ہو چکی ہیں کہ لوگ قتال فی سبیل اللہ زبردستی اسلام میں داخل کرنے کو سمجھتے ہیں' جبکہ اس کا مقصد اللہ کے کلمے کی سربلندی ہے تا کہ اس کی حکمرانی قائم ہو جائے اور ''وَيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ'' کا نقشہ عملی طور پر لوگ دیکھ سکیں۔ انفرادی طور پر لوگ پابند نہیں بنائے جائیں گے کہ وہ دائرۂ اسلام میں داخل ہوں' جیسا کہ ارشاد ہے: ﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۗ﴾ (البقرۃ:۲۵۶) ''دین (کو قبول کرنے) میں کوئی جبر نہیں ہے۔''

❁❁❁

نفل نمازوں کی اہمیّت اور ضرورت

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

ہر مسلمان پر ایک دن رات کے دوران پانچ نمازیں فرض ہیں۔ ان کی ادائیگی انتہائی ضروری ہے۔ حضرت ابوالدرداء ؓ سے روایت ہے کہ میرے خلیل و محبوب ﷺ نے مجھے وصیت فرمائی ہے کہ ''اللہ کے ساتھ کبھی کسی چیز کو شریک نہ کرنا اگرچہ تمہارے ٹکڑے کر دیے جائیں اور تمہیں آگ میں بھون دیا جائے اور خبردار کبھی بالارادہ نماز نہ چھوڑنا کیونکہ جس نے (دیدہ و دانستہ اور) عمداً نماز چھوڑ دی تو اس کے بارے میں وہ ذمہ داری ختم ہوگئی (جو اللہ کی طرف سے اس کے وفادار اور صاحبِ ایمان بندوں کے لیے ہے) اور خبردار شراب کبھی نہ پینا کیونکہ وہ ہر برائی کی کنجی ہے۔'' (سنن ابن ماجہ)

فرض نمازوں کو مسجد میں جا کر باجماعت پڑھنے کا تاکیدی حکم ہے۔ ایک نابینا صحابی ؓ نے جب رسول اللہ ﷺ سے اپنی معذوری کے سبب اجازت مانگی کہ وہ فرض نماز گھر میں پڑھ لیا کریں تو آپؐ نے انہیں اجازت نہ دی اور فرمایا: ''اگر تم اذان کی آواز سنتے ہو تو تم فرض نمازیں مسجد میں آ کر باجماعت ادا کیا کرو۔'' (مسلم)

جماعت کے ساتھ فرض نماز کی ادائیگی کا حکم ﴿وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾﴾ (البقرۃ) کے الفاظ کے ساتھ قرآن مجید میں موجود ہے۔ نماز کے ارکان مثلاً قیام، رکوع، سجدہ اور قعدہ اللہ کے حضور حاضر ہونے کی پسندیدہ حالتیں ہیں۔ ان میں پھر سجدے کی حالت کو زیادہ فضیلت حاصل ہے۔ صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بندہ سجدے کی حالت میں اپنے رب کے انتہائی قریب ہوتا ہے، اس لیے سجدے کی حالت میں زیادہ دعائیں کرو۔''

نماز کو رسول اللہ ﷺ نے اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک فرمایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ فرائض کے علاوہ بھی کثرت کے ساتھ نمازوں میں مشغول رہا کرتے تھے، اور ہر فرض نماز کے ساتھ نوافل کا بھی اہتمام کرتے تھے۔ نفل زاید چیز کو کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں مالِ غنیمت کو

انفال کیا گیا ہے، کیونکہ اصل چیز تو اللہ تعالیٰ کے دین کی سربلندی کے لیے جہاد و قتال ہے اور اس عمل میں اگر دشمن کا کچھ مال بھی مل گیا تو گویا یہ ایک زاید فائدہ ہوا۔ اس اضافی فائدے کو انفال کہا گیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نفل بھی کثرت کے ساتھ پڑھتے تھے۔ اس ضمن میں آپؐ کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ بعض اوقات آپؐ اتنی دیر تک نفل پڑھتے رہتے کہ کھڑے کھڑے پاؤں میں ورم آجاتا تھا۔ ہر فرض نماز کے ساتھ نبی مکرم ﷺ کچھ نوافل ضرور پڑھتے تھے۔ ایسے نوافل افراد اُمت کے لیے سُنّت کی حیثیت سے رائج ہیں، جیسے صبح کی نماز میں فرضوں سے پہلے دو رکعتیں، ظہر کی نماز سے پہلے چار رکعتیں اور بعد میں دو رکعتیں، مغرب میں فرضوں کے بعد دو رکعتیں اور عشاء میں فرضوں کے بعد دو رکعتیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو مسلمان آدمی ہر روز فرضوں کے علاوہ اللہ کی رضا کی خاطر بارہ رکعتیں نفل ادا کرتا ہے تو اللہ اس کے لیے جنت میں ایک گھر بنا دیتا ہے''۔ (مسلم) یہ تو وہ بارہ رکعتیں ہیں جو ہر فرض نماز کے ساتھ جوڑ دی گئی ہیں۔ ان کے علاوہ بھی نفل نمازیں پڑھنے کا معمول ہونا چاہیے جن کا بہترین وقت رات ہے۔ جن نفل نمازوں کے متعلق یہ مشہور ہے کہ آپؐ ان میں اتنا طویل قیام کرتے کہ آپؐ کو پاؤں میں ورم آجاتا، وہ آپؐ کے رات کے نفل ہی ہوتے تھے۔ صحابہ کرام ؓ تو آپؐ کے شیدائی تھے، جو عمل آپ کو محبوب ہوتا تھا وہ اُن کا بھی پسندیدہ عمل ہو جاتا تھا، چنانچہ صحابہ کرام ؓ بھی کثرت کے ساتھ نوافل پڑھتے تھے۔

فرض نمازیں تو مسجد میں جا کر جماعت کے ساتھ پڑھنی ضروری ہیں مگر نفلوں کے لیے بہترین جگہ گھر ہے۔ فرضوں سے ماقبل کی سنتیں گھر میں پڑھی جائیں اور بعد کی سنتیں بھی گھر آ کر ادا کی جائیں۔ اگرچہ مسجد میں بھی پڑھ سکتے ہیں مگر گھر میں پڑھنے کا ثواب زیادہ ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ''تم اپنی نمازوں کو اپنے گھروں میں پڑھا کرو اور اپنے گھروں کو قبرستان نہ بناؤ'' (مسلم) اس سے مراد نفل نمازیں ہیں، کیونکہ فرض تو بہرحال مسجد میں ہی ادا کیے جائیں گے۔

نفل نمازیں گناہوں کی بخشش کا سبب ہیں۔ ان کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ فرض نمازوں کی ادائیگی میں اگر کمی رہ گئی ہو تو اللہ تعالیٰ اپنی خاص رحمت سے اُس کمی کو نفلوں کے ذریعے پوری فرما دیں گے۔ جامع ترمذی کی ایک روایت میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قیامت کے دن بندے کے اعمال میں سے سب سے پہلے نماز کا حساب ہوگا اور اس کی نماز جانچی جائے گی، اگر وہ ٹھیک نکلی تو بندہ فلاح یاب اور کامیاب ہو جائے گا اور اگر وہ خراب نکلی تو بندہ ناکام اور نامراد رہ

جائے گا۔ پھر اگر اس کے فرائض میں کمی ہوئی تو ربّ کریم فرمائے گا کہ دیکھو کیا میرے بندے کے ذخیرۂ اعمال میں فرائض کے علاوہ کچھ نیکیاں (سنتیں یا نوافل) ہیں تاکہ اُن سے اِس کے فرائض کی کمی پوری ہو سکے؟ پھر نماز کے علاوہ باقی اعمال کا حساب بھی اسی طرح ہوگا۔

کچھ نوافل خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''فرض نماز کے بعد سب سے افضل وسط رات کی نماز ہے' یعنی نماز تہجد۔'' (صحیح مسلم) عشاء اور فجر کے درمیان کوئی نماز فرض نہیں کی گئی۔ یہ وقت آرام کرنے کا ہے' مگر جو بندہ عشاء کی نماز پڑھ کر سو جائے اور آدھی رات گزرنے کے بعد کسی وقت اٹھ جائے اور وضو کر کے اُس سکوت اور سناٹے میں نفلوں کے لیے کھڑا ہو جائے اور فجر کا وقت شروع ہونے سے پہلے پہلے فارغ ہو جائے تو یہ نماز تہجد ہے۔ چونکہ رات کے وقت نیند اور آرام کو قربان کرنا آسان کام نہیں اس لیے اس قیام کا ثواب بھی بے انتہا ہے۔ سورۃ الاسراء میں اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو تہجد کی نماز کا حکم دینے کے ساتھ ساتھ مقام محمود کی امید بھی دلائی ہے۔ مقامِ محمود عالمِ آخرت اور جنت میں بلند ترین مقام ہوگا۔ گویا مقامِ محمود کی نمازِ تہجد کے ساتھ خصوصی مناسبت ہے۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی خاص رحمت کے ساتھ ہر رات کے آخری حصّہ میں اپنے بندوں کی طرف متوجّہ ہوتا ہے۔ اُس وقت جو لوگ اللہ تعالیٰ کے حضور رکوع و سجود میں مشغول ہوں اُن کی خوش بختی کا کیا کہنا! تہجد کے علاوہ کچھ اور نفل نمازیں بھی ہیں جن کی خصوصی فضیلت ہے۔ ان میں نماز اشراق ہے جو طلوعِ آفتاب کے تھوڑی دیر بعد پڑھی جاتی ہے' پھر نماز چاشت ہے جو دن کے اچھی طرح چڑھنے کے بعد پڑھی جاتی ہے۔ ان نمازوں کو بھی گناہوں کی بخشش کا وسیلہ قرار دیا گیا ہے۔

نفل نمازوں کی اس قدر فضیلت کا تقاضا ہے کہ بندہ ان نمازوں کے لیے ضرور وقت نکالے۔ دنیوی مفاد کے لیے انسان کتنی مشقت اور تکلیف اٹھاتا ہے' روزی کی تلاش میں کہاں کہاں کی خاک چھانتا پھرتا ہے اور اس ساری تگ و دو کا مقصد حیاتِ مستعار کے اوقات کو بہتر بنانا ہوتا ہے' جبکہ نوافل میں لگائی ہوئی محنت اور وقت انسان کی خطاؤں کی معافی اور آخرت کی کامیابی کا باعث بنے گا۔ صرف فرض نمازوں پر قناعت کرنا مناسب نہیں' بلکہ زندگی کے شب و روز سے آنے والی ابدی زندگی کے لیے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی خاطر نفل نمازوں کا اہتمام کرنا بھی ضروری ہے۔

نفل نمازوں میں تحیۃ الوضوء کے دو نفل بھی ہیں جو وضو کے بعد شکرانے کے طور پر

پڑھے جاتے ہیں' ان کی بھی بڑی فضیلت ہے۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اس نماز کے ساتھ خصوصی دلچسپی تھی' جس کے نتیجہ میں رسول اللہ ﷺ نے انہیں اپنے آگے آگے جنت میں دیکھا۔ اسی طرح تحیۃ المسجد وہ دو رکعتیں ہیں جو بندہ مسجد میں داخل ہو کر بیٹھنے سے پہلے ادا کرے' گویا یہ شکرانے کے دو نفل ہیں جو وہ مسجد میں آنے کی توفیق دینے پر اللہ کے حضور ادا کرتا ہے۔

رمضان کے مبارک مہینے کی راتوں میں نوافل کی کثرت کا بہت بڑا اجر و ثواب ہے۔ یہ نوافل تراویح کے نام سے امت میں معروف ہیں اور رمضان کی راتوں میں ان کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ تراویح کی یہ نماز جماعت کے ساتھ ادا کی جاتی ہے اور اس میں پورا قرآن حکیم از اول تا آخر پڑھا جاتا ہے۔ جو لوگ سارا مہینہ باقاعدگی سے تراویح پڑھتے ہیں وہ اس نماز کے دوران قرآن حکیم کی مکمل قراءت سن لیتے ہیں اور ڈھیروں ثواب کے حق دار قرار پاتے ہیں حتیٰ کہ اس نماز پر گناہوں کی بخشش کی خوشخبری دی گئی ہے—— جس طرح رمضان شریف میں دن کا روزہ فرض اور فضیلت کا باعث ہے اسی طرح رات کے نوافل بھی گناہوں کی بخشش کی خاص تاثیر رکھتے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو لوگ رمضان کی راتوں میں نوافل (تراویح و تہجد) پڑھیں گے ان کے سب پچھلے گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔'' (بخاری و مسلم)

جس طرح پیچھے ذکر ہوا کہ نفل نمازوں کے ذریعے اللہ تعالیٰ بندے کی فرض نمازوں میں کمی اپنے فضل و کرم سے پوری کر دیں گے' اسی طرح امید ہے کہ نفل روزوں کے ذریعے رمضان کے فرض روزوں کی کمی اور نفلی صدقات کے ذریعے زکوٰۃ کی ادائیگی میں کمی اور کوتاہی بھی پوری کر دی جائے گی۔ پھر کون مسلمان بندہ ایسا ہے کہ جو یہ دعویٰ کر سکے کہ شعور کی زندگی سے لے کر آج تک اُس نے پورے فرائض کسی کمی اور کوتاہی کے بغیر ادا کیے ہیں؟ اگر ایسا نہیں' اور یقیناً ایسا نہیں ہے تو ہر مسلمان کے لیے لازم ہے کہ فرض نمازوں کے ساتھ نفل نمازوں کا بھی اہتمام کرے' رمضان کے روزوں کے علاوہ نفل روزے بھی رکھے اور فرض زکوٰۃ کے علاوہ صدقات' اور خیرات بھی دیتا رہے' کیونکہ یہ وہ چیزیں ہیں جو آخرت میں اس وقت کام آنے والی ہیں جب کوئی دوست' عزیز رشتہ دار' حتیٰ کہ ماں باپ اور اولاد بھی کچھ کام نہ آئیں گے اور ہر کوئی خود اپنے اعمال کا جواب دہ ہوگا۔

❁❁❁

تحریکِ تجدّد اور متجدّدین (۷)

حافظ محمد زبیر

غلام احمد پرویز

غلام احمد پرویز ۹ جولائی ۱۹۰۳ء کو بھارتی پنجاب کے ایک شہر 'بٹالا' ضلع گورداسپور میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا حکیم مولوی رحیم بخش ایک عالم دین اور چشتیہ نظامیہ سلسلہ کے بزرگ تھے۔ پرویز صاحب نے ۱۹۲۷ء میں گورنمنٹ آف انڈیا کے سنٹرل سیکرٹیریٹ میں ملازمت اختیار کی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اسی دوران ان کی ملاقات علامہ اقبال مرحوم سے بھی ہوئی۔ انہوں نے ۱۹۳۸ء میں ماہنامہ ''طلوعِ اسلام'' جاری کیا۔ شروع میں مولانا مودودی رحمہ اللہ کے ساتھیوں میں سے تھے اور کہا جاتا ہے کہ یہ غلام احمد پرویز ہی تھے جنہوں نے علامہ اقبال اور چوہدری نیاز علی خان کے سامنے پٹھانکوٹ کے اسلامی تحقیقی ادارے 'دارالاسلام' کے لیے مولانا مودودی رحمہ اللہ کا نام پیش کیا تھا' لیکن بعد میں جب پرویز صاحب نے حدیث کا انکار کیا تو ان کے اور مولانا مودودی رحمہ اللہ کے مابین شدید اختلاف کا ظہور ہوا۔ پرویزی فکر کی تردید میں مولانا مودودی رحمہ اللہ نے 'سنت کی آئینی حیثیت' نامی معرکۃ الآراء کتاب لکھی جس نے عقلی' منطقی اور نقلی دلائل کی روشنی میں پرویزی فکر کی جڑوں پر کلہاڑا رکھ دیا۔

پرویز صاحب نے ۱۹۵۱ء میں اسسٹنٹ سیکرٹری کے طور پر ریٹائرمنٹ لے لی۔ کراچی میں درسِ قرآن کا آغاز کیا اور ۱۹۵۸ء میں لاہور منتقل ہوئے۔ ۲۴ فروری ۱۹۸۵ء کو فوت ہوئے۔ انہوں نے ایک بیوہ کو سوگوار چھوڑا جبکہ ان کی اولاد نہ تھی۔ ان کا کام اب طلوعِ اسلام ٹرسٹ' قرآنک ریسرچ سنٹر' قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی اور پرویز میموریل لائبریری وغیرہ کے ذریعہ عام کیا جا رہا ہے۔

پرویز صاحب کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ تحریکِ پاکستان کے کارکنان میں سے

تھے اور قائداعظم محمد علی جناح کے مشیر خاص بھی رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اس سیاسی اور معاشرتی مقام یا status کی وجہ سے ان کا فکر پاکستان کے مقتدر طبقے میں عام ہوا۔

کتب اور علمی کام

پرویز صاحب نے متفرق موضوعات پر کتابیں لکھی ہیں' جن میں انہوں نے اپنے فکر کو کھل کر بیان کیا ہے۔ ان کتابوں کے نام ذیل میں بیان کیے جا رہے ہیں:

۱۔ معارف القرآن	۲۔ مفہوم القرآن	۳۔ مطالب القرآن
۴۔ لغات القرآن	۵۔ تبویب القرآن	۶۔ نظامِ ربوبیت
۷۔ تصوف کی حقیقت	۸۔ سلیم کے نام	۹۔ طاہرہ کے نام
۱۰۔ قرآنی فیصلے	۱۱۔ شاہکارِ رسالت	۱۲۔ برقِ طور
۱۳۔ جوئے نور	۱۴۔ من و یزداں	۱۵۔ جہانِ فردا
۱۶۔ ابلیس و آدم	۱۷۔ مقامِ حدیث	۱۸۔ مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں
۱۹۔ اسبابِ زوالِ اُمت	۲۰۔ معراجِ انسانیت	۲۱۔ انسان نے کیا سوچا؟
۲۲۔ اسلام کیا ہے؟	۲۳۔ شعلۂ مستور	۲۴۔ کتاب التقدیر

افکار و آراء

غلام احمد پرویز صاحب نے کتاب اللہ کی تفہیم میں سُنّتِ نبوی ﷺ کی ضرورت و اہمیت کا انکار کیا اور وہ محض عربی زبان کی مدد سے قرآن مجید کو براہ راست سمجھنے کے مدعی تھے۔ عربی زبان کی مدد سے قرآن کریم کے براہِ راست مطالعہ کے نتیجہ میں پرویز صاحب نے اپنے کئی ایک نئے فلسفے یا نظریات و افکار متعارف کروائے۔ برصغیر پاک و ہند میں جس شخص نے سب سے پہلے حدیث و سنت کا انکار کیا وہ عبداللہ چکڑالوی تھے۔ ان کے بعد مولوی احمد الدین امرتسری نے اس فکر کو آگے بڑھایا۔ اس کے بعد حافظ اسلم جیراج پوری نے اس فکر کو مزید مزین کیا اور آخر میں غلام احمد پرویز صاحب نے انکارِ حدیث و سنت کے اس فکر کو باقاعدہ ایک مکتبِ فکر یا مسلک کی صورت میں مدوّن کر دیا۔ علاوہ ازیں مولوی محبّ الحق عظیم آبادی' تمنا عمادی' نیاز فتح پوری اور علامہ مشرقی وغیرہم نے بھی انکارِ حدیث کی تحریک میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

ایمان باللہ کا تصوّر

پرویز صاحب کا خیال ہے کہ قرآن مجید میں جہاں جہاں لفظ 'اللہ' آیا ہے تو اس سے مراد اللہ کی ذات نہیں بلکہ 'اللہ کا قانون' یا 'نظامِ ربوبیت' ہے اور قرآن مجید میں اللہ کی جو صفات بیان کی گئی ہیں وہ درحقیقت اللہ کے دیے ہوئے قانون کی صفات ہیں۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:

''سلیم اگر تم ایک اہم نکتہ سمجھ لو تو قرآن فہمی میں تمہاری بہت سی مشکلات کا حل خود بخود نکل آئے گا' یعنی ان مقامات میں جہاں قرآن کریم میں لفظ 'اللہ' استعمال ہوا ہے' اللہ کی جگہ اگر تم 'اللہ کا قانون' کہہ لیا کرو تو بات بالکل واضح ہو جائے گی۔''

(سلیم کے نام: ۱/۱۷۳)

ایک اور مقام پر پرویز صاحب اپنے فلسفۂ نظامِ ربوبیت یا مارکسزم کی شرح میں لکھتے ہیں:

''ہم اس مقام پر ایک اہم نکتہ کی وضاحت ضروری سمجھتے ہیں' جسے آگے بڑھنے سے پہلے سمجھ لینا ضروری ہے۔ ہم نے 'اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ.....' کی آیت میں بھی اور مذکورہ صدر آیت میں 'اللہ' سے مراد لیا ہے: ''وہ معاشرہ جو قانونِ خداوندی کو نافذ کرنے کے لیے متشکّل ہو۔'' (نظام ربوبیت: ص ۱۵۸)

اسی طرح آیت مبارکہ ﴿وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا﴾ (ھود:۶) کی تفسیر میں پرویز صاحب لکھتے ہیں:

''ہم نے (اس آیت میں) اللہ سے مراد لیا وہ معاشرہ جو قانونِ خداوندی کو نافذ کرنے کے لیے متشکّل ہو۔'' (نظام ربوبیت: ص ۱۵۸)

اور اس قانونِ خداوندی سے پرویز صاحب کی مراد مارکس کا دیا ہوا فلسفہ ہوتا ہے جس سے وہ حد درجہ متاثر نظر آتے ہیں۔ آسان الفاظ میں پرویز کے نزدیک قرآن مجید میں لفظ رب یا اللہ سے مراد وہ معاشرہ ہے جو ''قانونِ الٰہی'' یعنی مارکسزم کے فلسفہ پر قائم ہو' اور اس رب یا اللہ کی صفات سے مراد ''قانونِ الٰہی'' یا مارکسزم کی بنیاد پر قائم معاشرے کی صفات ہیں۔ ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:

''انسانوں کے خودساختہ مذہب کے پیدا کردہ خدا پر ایمان لانے اور اس کے دعاوی پر توکّل رکھنے سے وہ یقین کسی طرح پیدا نہیں ہو سکتا جو انسان کو احتیاج کی فکر سے بے خوف کر دے۔ یہی وہ خدا تھا جس کے متعلق مارکس نے کہہ دیا تھا کہ اس کا تصور سرمایہ داروں کی مصلحت کوشیوں کا پیدا کردہ ہے' لیکن 'خدا' کے تصور کا ایک مفہوم وہ

ہے جسے خود خدا نے متعین کیا ہے اور جو قرآن کے حروف و نقوش میں جگمگ جگمگ کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اس تصور کی رو سے ان مقامات پر خدا سے عملاً مفہوم وہ نظام ہے جو اس کے قوانین کو نافذ کرنے کے لیے متشکل ہوتا ہے اور اس طرح وہ تمام ذمہ داریاں اپنے سر لے لیتا ہے جنہیں خدا نے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔''

اسی طرح پرویز صاحب کے نزدیک جہاں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے الفاظ ایک ساتھ آئے ہیں تو اس سے مراد 'اسلامی نظامِ حکومت' ہے۔ پرویز صاحب نے اس بنیاد پر 'مرکزِ ملت' کے نام سے اپنا نیا فلسفہ متعارف کروایا۔ اس فلسفہ کے مطابق قرآن مجید میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت سے مراد نظام ربوبیت یعنی مارکسزم کی بنیاد پر قائم حکومت کی اطاعت ہے۔ ایک جگہ پرویز صاحب لکھتے ہیں:

''حکومت کے انتظامی امور کے لیے ایک مرکز ہوگا اور اس مرکز کے ماتحت افسرانِ مجاز' قرآن کریم میں اس کے لیے 'خدا اور رسول' کی اصطلاح آئی ہے یعنی وہ نظامِ خداوندی جسے رسول اللہ نے متشکّل فرمایا۔ خدا اور رسول کی اطاعت سے مقصود اسی مرکزی حکومتِ خداوندی کی اطاعت ہے۔'' (قرآنی فیصلے: ص ۶)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

''رسول اللہ کے بعد خلیفۃ الرسول' رسول اللہ کی جگہ لے لیتا ہے' اب خدا اور رسول کی اطاعت سے مراد جدید مرکز حکومت کی اطاعت ہوتی ہے۔'' (معراجِ انسانیت: ۳۵۷)

ایمان بالرسالت

یہ تو پرویز صاحب کا ایمان باللہ کے بارے عقیدہ تھا کہ کبھی تو ان کی اللہ یا رب سے مراد ''نظامِ ربوبیت'' یا مارکسزم پر قائم معاشرہ ہوتا ہے جبکہ وہ لفظ قرآن مجید میں اکیلا مستعمل ہوا ہو اور کبھی ان کی اس سے مراد اس معاشرے کو قائم کرنے والی مرکزی حکومت یا سنٹرل اتھارٹی اور ان کے ماتحت افسران ہوتے ہے جبکہ وہ لفظ قرآن مجید میں رسول کے ساتھ استعمال ہوا ہو۔ اب ایمان بالرسالت کے بارے میں اگر پرویز صاحب کے عقیدہ کا جائزہ لیا جائے تو اس بارے میں پرویز صاحب کا خیال ہم اوپر نقل کر چکے ہیں کہ اس سے ان کی مراد وہی مرکزِ ملّت یا سنٹرل اتھارٹی ہے' یعنی خدا اور رسول مل کر ایک اصطلاح بنی ہے اور اس سے مراد مرکزِ ملّت یا سنٹرل اتھارٹی ہے اور رسول کی اطاعت سے مراد اس مرکز ملت کی اطاعت ہے۔ ایک جگہ آیت مبارکہ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ﴾

(النساء:۵۹) کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''اس آیت مقدسہ کا مفہوم بالکل واضح ہے' اس میں 'اللہ ورسول' سے مراد مرکز ملت یعنی نظامِ خداوندی (central authority) اور اولوالامر سے مفہوم افسرانِ ماتحت ہیں۔'' (معراج انسانیت:ص۳۲۲)

پس پرویز صاحب کے نزدیک قرآن مجید میں لفظ رب یا اللہ سے مراد تو وہ معاشرہ ہے جو نظامِ ربوبیت یعنی مارکسزم کی بنیاد پر قائم ہو اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت سے مراد ایسے معاشرے کو چلانے والی مرکزی حکومت کی اطاعت اور اولوالامر کی اطاعت سے مراد اس مرکزی حکومت کے ماتحت افسران کی اطاعت ہے۔

پرویز صاحب نے ''قصۂ آدم'' کو انسان کا قصہ قرار دیا ہے اور حضرت آدم علیہ السلام کی شخصیت کا انکار کیا ہے۔ یعنی ان کے بقول قرآن میں جہاں جہاں لفظ آدم آتا ہے تو اس سے مراد کوئی شخص واحد نہیں تھا بلکہ یہ ایک نوع تھی جس نوع کا اللہ تعالیٰ نے بندروں میں سے انتخاب کیا تھا تاکہ اسے انسان بنائے۔ حضرت آدم علیہ السلام کی نبوت کا بھی انکار کیا ہے' کیونکہ ان کے نزدیک آدم کسی شخص کا نام ہی نہیں ہے بلکہ یہ ایک نوع ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ارتقا کے مراحل میں انسان بنانے کے لیے بندروں میں سے چُن لیا تھا۔

ایمان بالآخرت

جہاں تک ایمان بالآخرت کا معاملہ ہے تو اس بارے میں پرویز صاحب کا عقیدہ ہے کہ جنت اور جہنم کسی اُخروی زندگی یا حیات میں کسی اچھی بری جگہ یا مکان کا نام نہیں ہے بلکہ یہ بندۂ مؤمن پر اس دنیا میں طاری ہونے والی کچھ کیفیات کا نام ہے۔ ایک جگہ جہنم کے بارے میں لکھتے ہیں:

''جہنم انسان کی قلبی کیفیت کا نام ہے' لیکن قرآن کریم کا انداز یہ ہے کہ وہ غیر محسوس' مجرد حقائق کو محسوس مثالوں سے سمجھاتا ہے۔'' (جہانِ فردا:ص۲۳۵)

جنت کے بارے میں اپنے نظریات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''جہنم کی طرح اُخروی جنت بھی کسی مقام کا نام نہیں' کیفیت کا نام ہے۔''

(جہان فردا:ص۲۷۰)

ایک اور جگہ جنت کی نعمتوں کے بارے میں اپنا نقطہ نظر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جنت کی آسائشیں اور زیبائشیں' وہاں کی فراوانیاں اور خوشحالیاں اس دنیا کی زندگی

میں حاصل ہو جاتی ہیں' مرنے کے بعد کی جنت کے سلسلہ میں ان کا بیان تمثیلی ہے۔''

(نظامِ ربوبیت:ص۸۲)

پرویز صاحب نے روزِ حشر اور قیامت کا بھی انکار کیا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:

''یہ تصور صحیح نہیں کہ جتنے لوگ مرتے ہیں وہ مرنے کے بعد قبروں میں روک لیے جاتے ہیں' اور پھر ان سب کو ایک دن اکٹھا اٹھایا جائے گا' اسے حشر یا قیامت کا دن کہا جاتا ہے۔'' (جہانِ فردا:ص۱۸۰)

ایک جگہ قرآنی الفاظ 'یوم القیامۃ' کی تاویل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یوم القیامۃ سے مراد ہوگا وہ انقلابی دور جو قرآن کی رو سے سامنے آیا تھا۔''

(جہانِ فردا:ص۱۳۳)

ایک اور جگہ قرآنی لفظ 'الساعۃ' کی تاویل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''الساعۃ سے مراد حق و باطل کی وہ آخری جنگ ہوتی ہے جس سے باطل کی قوتیں شکست کھا کر برباد ہو جاتی ہیں۔'' (لغات القرآن:۹۱۸/۲)

فرشتوں پر ایمان

فرشتوں کے بارے میں پرویز صاحب کا خیال ہے کہ یہ کوئی علیحدہ سے خدائی مخلوق نہیں ہیں بلکہ بعض انسانی داخلی قوتوں کو ملائکہ کا نام دیا گیا ہے۔ ایک جگہ پرویز صاحب لکھتے ہیں:

''ملائکہ ہماری اپنی داخلی قوتیں ہیں' یعنی ہمارے اعمال کے وہ اثرات جو ہماری ذات پر مرتب ہوتے رہتے ہیں۔'' (ابلیس وآدم:ص۱۶۲)

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

''ملائکہ یعنی کائنات کی قوتیں جن سے رزق پیدا ہوتا ہے' انسان کے تابع فرمان ہیں۔''

(ابلیس وآدم:ص۵۲)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

''فرشتے' ملائکہ' وہ کائناتی قوتیں ہیں جو مشیتِ خداوندی کے پروگرام کو بروئے کار لانے کے لیے زمانے کے تقاضوں کی شکل میں سامنے آتی ہیں۔''

(اقبال اور قرآن:ص۱۶۵)

پرویز صاحب نے قرآن مجید میں جِنّات سے مراد بدوی اور وحشی قبائل لیے ہیں۔

فرشتوں اور جنات کے بارے میں یہ تقریباً وہی نقطہ نظر ہے جو سرسید مرحوم کا تھا۔ تقدیر کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ مجوسیوں نے یہ عقیدہ اسلام میں داخل کیا ہے۔

ایمان بالقرآن

پرویز صاحب قرآن مجید کو ابدی وحی مانتے ہیں' لیکن حدیث وسنت کے ذریعے قرآن کی تفسیر کے قائل نہیں ہیں اور ان کا کہنا یہ ہے کہ قرآن نے اصول دے دیے ہیں اور ان اصولوں کی تشریح اور توضیح کے مطابق ایک اسلامی نظامِ حیات یا قانون کی تفصیلات ہم خود طے کریں گے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''قرآن کریم نے صرف اصولی احکام دیے ہیں اور یہ چیز انسانوں پر چھوڑ دی ہے کہ وہ اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق ان اصولوں کی روشنی میں جزئی قوانین ایک نظام کے تابع خود مرتب کریں۔'' (لغات القرآن: ۴۷۹/۲)

پرویز صاحب قرآن مجید کی تفسیر خود کرنے کے قائل ہیں اور اللہ کے رسول ﷺ کی طرف سے کی گئی قرآنی تفسیر کی ضرورت اور اہمیت کے منکر ہیں۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:

''قرآن کے اصول مکمل غیر متبدل اور ابدی ہیں' اس لیے اب کسی نبی کی ضرورت نہیں۔ باقی رہا یہ تصور کہ ان اصولوں کو سمجھانے کے لیے ایسے شخص کی ضرورت ہے جو خدا کی طرف سے ان اصولوں کو سمجھنے کا علم حاصل کرے اور انہیں پھر دوسرے انسانوں کو سمجھائے تو یہ تصور یکسر غیر قرآنی ہے۔ قرآن کریم نے کہیں نہیں کہا کہ میری تعلیم سمجھانے کے لیے بھی کسی مامور من اللہ یا ملہم ربانی کی ضرورت ہے۔''

(قرآنی فیصلے: ۲۶۰/۳)

قرآنی آیات کی پرویزی تفسیر کے چند نمونے

پرویز صاحب نے قرآن کے دیگر مقامات کو بھی اپنی تاویلات کا تختہ مشق بنایا ہے' مثلاً قرآنی آیت ﴿فَلَبِثَ فِيهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا﴾ (العنکبوت: ۱۴) یعنی ''حضرت نوح علیہ السلام اپنی قوم میں ۹۵۰ سال رہے'' کی تاویل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ عربی زبان میں 'سَنَة' کے لفظ سے مراد 'فصل' ہوتی ہے اور ایک سال میں چار فصلیں ہوتی ہیں' لہٰذا ہزار فصلوں کا معنی ۲۵۰ سال ہوئے اور اس میں سے ۵۰ سال نکال لیں تو ۲۰۰ سال باقی رہ گئے' لہٰذا حضرت نوح علیہ السلام کی عمر ۲۰۰ برس ہوئی جو معقول بات ہے۔

اسی طرح قرآنی آیت ﴿وَقَالَ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ﴾ (النمل: ۱۶) یعنی ''حضرت سلیمان علیہ السلام نے کہا: اے لوگو! ہمیں پرندوں کی بولی سکھائی گئی ہے'' کی تاویل میں فرماتے ہیں کہ 'منطق' سے مراد قواعد وضوابط ہیں اور 'طیر' سے مراد گھوڑے ہیں اور 'منطق الطیر' سے مراد گھوڑوں کے رسالہ سے متعلق علم ہے۔

﴿اَنِّيْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ (آل عمران: ۴۹) یعنی ''بلاشبہ میں تمہارے لیے مٹی سے پرندے کی ایک صورت بناتا ہوں پس میں اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ اللہ کے حکم سے پرندہ بن جاتا ہے'' کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ میں وحی کے ذریعے انسانوں کو حیات نو عطا کروں گا اور وہ خاک سے فضا میں اڑنے کے قابل ہو جائیں گے۔ ﴿وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا﴾ (البقرۃ: ۲۵۹) یعنی ''تم گدھے کی ہڈیوں پر غور کرو کہ کیسے ہم انہیں اٹھاتے ہیں اور انہیں گوشت کا لباس پہناتے ہیں'' کی تاویل یہ کی ہے کہ اس سے مراد رحمِ مادر میں انسان کا جنین ہے۔ ﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ﴾ (النساء: ۳۴) یعنی ''مرد عورتوں پر نگران ہیں'' کی تاویل یہ کرتے ہیں کہ آیت مبارکہ میں 'قوام' کا معنی روزی مہیا کرنے کا کیا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آگ میں پھینکے جانے والے واقعہ کی تاویل یہ کی کہ مشرکین نے انہیں اپنی دشمنی اور عداوت کی آگ میں پھینکا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو ذبح کرنے کے بارے میں یہ تاویل کی کہ یہ غلط فہمی تھی جو خواب کی غلط تعبیر کی صورت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو لاحق ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے انہیں اس غلط فہمی پر عمل سے اس طرح بچا لیا کہ ان کی جگہ کچھ اور ذبح ہو گیا۔ عصائے موسیٰ علیہ السلام سے پانی کے پھٹ کر دو دیواروں کی شکل میں کھڑے ہونے کی تاویل یہ کی کہ 'كُلُّ فِرْقٍ' سے مراد دونوں جماعتیں یعنی آلِ فرعون اور بنی اسرائیل کی جماعتیں تھیں جو تودوں کی مانند آمنے سامنے کھڑی ہوئیں۔ ﴿فَاَلْقٰىهَا فَاِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعٰى﴾ (طٰہٰ) یعنی ''حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا پھینکا تو وہ ایک دوڑتا ہوا سانپ بن گیا'' میں عصائے موسیٰ علیہ السلام سے مراد احکام لیے ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے سامنے پیش کیے تھے۔ ﴿وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ﴾ (آل عمران: ۴۶) یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام ''ماں کی گود میں کلام کریں گے'' کی تاویل یہ کی ہے کہ اس سے مراد ہے کہ وہ چھوٹی عمر میں خوب باتیں کرنے والا ہوگا۔

نماز کے بارے میں فرماتے ہیں کہ یہ ایک بے روح رسم اور پرستش ہے لیکن پھر بھی میں جمہور مسلمانوں کے طریقہ پر نماز تو پڑھ لیتا ہوں۔ پرویز صاحب کے نزدیک 'اقامتِ صلوٰۃ' سے مراد وہ موقت اجتماعات ہیں جو نظام ربوبیت کی یاد تازہ کرنے کے لیے منعقد کیے جائیں۔ زکوٰۃ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ زکوٰۃ کی کوئی شرح اسلام میں مقرر نہیں ہے' ایک اسلامی حکومت سارا مال بھی لے سکتی ہے۔ زکوٰۃ اور ٹیکس ایک ہی شے ہے' ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ قربانی کے بارے میں فرماتے ہیں کہ حج کے علاوہ قربانی ایک رسم اور قرآن پر جھوٹ ہے۔ حرم کعبہ سے مراد مکہ مکرمہ نہیں ہے بلکہ وہ جگہ ہے جہاں سے دینی احکام کا نفاذ ہو۔ بغیر سمجھے تلاوتِ قرآن پر اجر وثواب کے قائل نہیں ہیں اور اسے ایک عجمی سازش قرار دیتے ہیں۔

تعدّدِ ازواج کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی آسکتی ہے لیکن اس کی موجودگی میں نہیں۔ قرآنی حدود کے بارے میں فرماتے ہیں کہ قرآن نے جو سزائیں بتلائی ہیں وہ انتہائی سزائیں ہیں اور حدودِ شرعی نافذ کرنے والے ان سے کم سزائیں بھی جاری کر سکتے ہیں۔

پرویز پر کفر کا فتویٰ

امام حرم شیخ محمد بن عبداللہ السُّبیّل نے غلام احمد پرویز اور اس کے متّبعین کو کافر قرار دیا ہے۔ حکومت کویت کی طرف سے وزارتِ اوقاف کی فتویٰ کمیٹی کے چیئرمین شیخ مشعل مبارک عبداللہ احمد الصباح نے بھی پرویزی عقائد رکھنے والوں کو کافر قرار دیا ہے۔ سعودی عرب کے سابقہ مفتی اعظم شیخ عبدالعزیز بن باز رحمہ اللہ اور ان کے بعد شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ آل الشیخ نے بھی غلام احمد پرویز پر منکرِ حدیث ہونے کی وجہ سے کفر کا فتویٰ عائد کیا ہے۔

غلام احمد پرویز کے کفر کے بارے میں سعودی عرب کے ان علماء کے فتاوٰی کی تائید کرنے والوں میں مولانا محمد ادریس سلفی' مولانا ڈاکٹر سرفراز احمد نعیمی' مولانا محمد تقی عثمانی' مفتی عبدالقیوم ہزاروی' مولانا ڈاکٹر مفتی غلام سرور قادری' ڈاکٹر عبدالرزاق سکندر' مولانا سراج الدین' مولانا محمد یوسف لدھیانوی' مولانا حافظ عبدالقادر روپڑی' مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی' مولانا عبدالحفیظ مکی' مولانا منظور احمد چنیوٹی' مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہ مدنی' مولانا مفتی عاشق الٰہی البرنی' مفتی ڈاکٹر عبدالواحد' مولانا عبدالستار خان نیازی' مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری' مولانا مجاہد الاسلام قاسمی' مولانا محمد اجمل قادری' مولانا ریاض الحسن نوری' مولانا عبدالرحمٰن مدنی'

مولانا ابوعمار زاہد الراشدی' مولانا عبدالمالک' مولانا مفتی الیاس کشمیری' ڈاکٹر اسرار احمد وغیرہ شامل ہیں۔

۱۹۶۲ء میں غلام احمد پرویز کے بارے میں تکفیر کی ایک مہم چلائی گئی اور اس بارے میں ایک مفصّل فتویٰ مرتب ہوا۔ ۲۵۶ صفحات پر مشتمل یہ فتویٰ 'پرویز کے بارے علماء کا متفقہ فتویٰ' کے نام سے عربیہ اسلامیہ' کراچی سے شائع ہوا۔ اس فتویٰ پر ۱۰۲۸ کے قریب علماء کے دستخط شامل ہیں' جن میں مولانا داؤد غزنوی' حافظ عبداللہ محدث روپڑی' حافظ عبدالقادر' مولانا مفتی محمود' مولانا مفتی محمد شفیع' مولانا احمد علی لاہوری' مولانا احتشام الحق تھانوی' مولانا ظفر احمد عثمانی' مولانا محمد ادریس کاندھلوی' مولانا غلام غوث ہزاروی' مولانا محمد یوسف بنوری' مفتی ولی حسن ٹونکی' محمد عبدالحامد قادری' محمد عبدالسلام قادری' محمد عبدالحلیم چشتی' محمد سلیم الدین چشتی' عبد الکریم قاسمی' محمد بہاء الحق قاسمی وغیرہ شامل ہیں۔ علاوہ ازیں کتاب کے آخر میں عالم عرب یعنی مکہ و مدینہ اور مصر و شام کے کبار علماء کے فتاوٰی بھی شامل کیے گئے ہیں۔

غلام احمد قادیانی کے بعد برصغیر پاک و ہند میں غلام احمد پرویز دوسرا شخص ہے کہ جس کی جمیع مکاتب فکر کے نمائندہ علماء نے تکفیر کی ہے اور اسے اور اس کے متبعین کو دائرۂ اسلام سے خارج قرار دیا ہے۔

مصادر و مراجع

۱۔ ماہنامہ محدث 'فتنہ انکار حدیث نمبر' ستمبر ۲۰۰۲ء' لاہور

۲۔ آئینہ پرویزیت' مولانا عبدالرحمٰن کیلانی' مکتبہ السلام' لاہور' ۲۰۰۴ء

۳۔ تفسیر مطالب الفرقان کا علمی و تحقیقی جائزہ' پروفیسر ڈاکٹر محمد دین قاسمی' ادارہ معارف اسلامی' لاہور

۴۔ جناب غلام احمد پرویز کے نظامِ ربوبیت پر ایک نظر' پروفیسر ڈاکٹر محمد دین قاسمی' بیت الحکمہ' لاہور' ۲۰۰۷ء

۵۔ جناب غلام احمد پرویز اپنے الفاظ کے آئینے میں' پروفیسر ڈاکٹر محمد دین قاسمی' بیت الحکمہ' لاہور' ۲۰۰۶ء

۶۔ ہفت روزہ الاعتصام 'حجیت حدیث' نمبر' دار الدعوۃ السلفیہ' لاہور' ۱۹۵۶ء

7-http://en.wikipedia.org

بقیہ: عرضِ احوال

جس کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: (ترجمہ) ''اللہ کے نزدیک اسلام ہی پسندیدہ دین ہے''۔ ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: (ترجمہ) ''بے شک ساری عزت اللہ ہی کے لیے ہے''۔ ذرا سوچیے' کیا اللہ کسی سے عزت کروانے کا محتاج ہے؟ اُس کے دین کو عزت دینا اور اُسے قائم کرنا درحقیقت مطلوب ہے۔ اختیار واقتدار ملنے کے باوجود ملک میں اللہ کے دین کو قائم نہ کرنا اللہ کی نگاہ میں بہت بڑا جرم ہے۔ اپنے انجام سے بے خبر لوگ کہتے ہیں کہ ستاون مسلم ممالک میں سے پاکستان پر ہی فرض ہے کہ وہ دین کو قائم و نافذ کرے؟ اس کے دو جواب ہیں: پہلا یہ کہ دنیا کے کسی اور مسلمان ملک کا مطلب ''لا الٰہ الا اللہ'' نہیں بتایا گیا تھا' کسی نے آزادی سے پہلے یہ وعدہ نہیں کیا تھا کہ ایک آزاد خطہ عطا فرمادے' ہم اُس میں تیرا پسندیدہ دین اسلام نافذ کریں گے اور دوسرا یہ کہ باقی ستاون مسلم ممالک نے اگر اللہ کے دین کو اپنے ہاں قائم و نافذ نہیں کیا تو ان کی دنیا میں کون سی عزت ہے؟ ہمیں اللہ اور اُس کے دین سے غداری کی سزا مل رہی ہے' اور پاکستان میں چونکہ فوج بلاشبہ مضبوط ترین' انتہائی طاقتور اور منظم ادارہ ہے اور اِس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ حکومت فوجی آمر کی ہو یا جمہوری سیاسی' پاکستان میں قوت کا اصل سرچشمہ فوج رہی ہے' لہٰذا زیادہ ذمہ داری بھی فوج کی ہے۔ ہم یہاں ایک وضاحت کر دیں کہ پاکستانی فوج کو اسلامی سپاہ بنانے کا ہرگز ہرگز مطلب یہ نہیں ہے کہ غیر مسلموں سے' چاہے وہ بھارت ہو یا امریکہ' جنگ چھیڑ دیں۔ لیکن ان کے ناجائز مطالبات کے سامنے جھک جانا اور ان کے دباؤ میں آ کر ہر وہ کام کر گزرنا جو اللہ سے بے وفائی اور غداری پر مشتمل ہو' اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایسا کرنا پاکستان کے ساتھ وفاداری نہیں' کھلی غداری ہے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ آغاز سے ہی فوجی جوانوں کی تربیت اسلامی بنیادوں پر کی جائے۔ پریڈ ہو یا نہ ہو' نماز سے غفلت پر کورٹ مارشل ہو۔ فوجیوں کے مختلف کورسز میں قرآن اور حدیث کی تعلیمات بھی ایک لازمی حصہ ہوں۔ اندرونِ ملک معاملہ ہو یا بیرونی ممالک سے تعلقات' سب فیصلے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں کیے جائیں گے' بالفاظ دیگر امور سلطنت میں قرآن وسنت کو مکمل بالادستی حاصل ہوگی۔ اور ہم یہ تجویز کرنے سے بھی گریز نہیں کریں گے کہ جس طرح بدقسمتی سے ترکی فوج کی آئینی ذمہ داری ہے کہ وہ مانیٹر کرے گی کہ ملک کو سیکولرازم کی بنیادوں پر چلایا جارہا ہے یا نہیں' آپ اگر پاکستان کی نظریاتی سرحدوں کے بھی محافظ بن جائیں تو آپ کے لیے خوش بختی کا معاملہ ہوگا۔ ہمیں یقینِ واثق ہے کہ ایسی صورت میں بھی اگرچہ افواجِ پاکستان کو گھوڑے تیار رکھنے کی ذمہ داری خود ہی نبھانا ہوگی' کیونکہ یہ بھی اللہ کا حکم ہے' لیکن پاکستان کی جغرافیائی سرحدوں کا ہی نہیں آپ کی عزت اور توقیر کا محافظ بھی اللہ ربّ العزت بن جائے گا۔ ان شاء اللہ! یاد رکھیے وہ اسباب کا محتاج نہیں بلکہ مسبب الاسباب ہے۔ وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلٰغ OO

تعلیم القرآن
عبدالرحمٰن صابر قریشی
⇦ لفظی و بامحاورہ ترجمہ مع گرامر ⇦ جامع تشریح (حواشی میں اور آخر میں رکوع وار)
⇦ فہرست مضامین ⇦ مکمل لغات القرآن (تعلیم القرآن لغت جلد چہارم)
تعلیم القرآن لغت ایک مکمل لغات القرآن، قرآن اور قرآنی عربی سیکھنے والوں کیلئے نادر و نایاب تحفہ!
اس لغت میں قرآن کے تمام الفاظ کو حروف تہجی کے لحاظ سے مع حوالۂ قرآن جمع کیا گیا ہے اور ہر لفظ کا مکمل ترجمہ' مفہوم' مادہ و مصدر اور صرفی تشریح (گرامر کے قواعد) کے ساتھ دیا گیا ہے' نیز بلحاظ مادہ و مصدر بھی تمام الفاظ قرآنی کو جمع کیا گیا ہے۔
تعلیم القرآن مکمل سیٹ چار جلدوں میں قریباً ۳۸۰۰ صفحات پر مشتمل ہے
جس میں لغت بھی شامل ہے (جبکہ لغت کی جلد الگ سے بھی لی جاسکتی ہے)
ہدیہ مکمل سیٹ =/۱۹۵۰ روپے (=/۱۳۸۰ روپے میں بارعایت vpp طلب فرمائیں)
سائز 20x26/8 کتابت: کمپیوٹرائزڈ
طباعت = آفسٹ/سفید کاغذ، خوبصورت 4 رنگی جلد
ادارہ تعلیم القرآن
19/C منصورہ ملتان روڈ لاہور 54570 پاکستان
Phone:042-35412949, 04235025227
Email: italeemulquran@yahoo.com, web: www.italeemulquran.net

دماغ اَفروز
قوت حافظہ اور دماغ کے لیے زبردست اکسیر
دماغ افروز ایسے اصحاب کے لیے جو دماغی محنت کرتے ہوں بہترین نعمت ہے۔
دماغ افروز دماغ کی خشکی، سر چکرانا، ذہنی ہیجان اور بے خوابی دور کرنے کی جادواثر دوا ہے۔
دماغ افروز دماغ کی تمام قوتیں بحال کرتا ہے۔
دماغ افروز بھوک کو چمکا کر قوت ہاضمہ کو درست کر کے غذا کو جزو بدن بناتا ہے۔
دماغ افروز زندگی کے لیے کیمیا ہے، صحت کے لیے اکسیر ہے اور دماغ کے لیے نعمت ہے۔
- اگر آپ کی قوت حافظہ اور ذہن اچھی طرح کام نہیں کرتا تو بہترین شے جو آپ استعمال کر سکتے ہیں وہ .... دماغ افروز ہے۔
- اگر آپ عینک اتارنے کے خواہشمند ہیں تو بھی کورس 2 ماہ کیجیے!
- پڑھنے والے بچوں بالخصوص حفظ کرنے والے بچوں کے لیے خاص تحفہ!
حکیم حافظ سید محمد احمد۔ لاہور
0332-8477326
042-38477326